کیفی اعظمی : ایک ہمہ جہت فنکار

مہاراجہ سیا جی راؤ یونیورسیٹی کی
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اُردو)
کے لئے تحریر کردہ تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

نسرین شیخ

نگراں کار
ڈاکٹر انور ظہیر انصاری
شعبہ فارسی، عربی اور اُردو
مہاراجہ سیا جی راؤ یونیورسیٹی۔ بڑودا

KAIFI AZMI : EK HAMA JEHAT FANKAR

A Thesis Submitted to
The M.S.University of Baroda
For The Award of Degree of
Doctor of Philosophy in Urdu

By

NASRIN SHAIKH

Department of persian,Arebic and Urdu
Fculty of Art
Maharaja Sayajirao University of Baroda
Baroda
Gujaraj
December-2012

کیفی اعظمی: ایک ہمہ جہت فنکار

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسیٹی کی
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اُردو)
کے لئے تحریر کردہ تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

نسرین شیخ

نگراں کار

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری

شعبۂ فارسی، عربی اور اُردو
مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسیٹی۔ بڑودا

دسمبر ۲۰۱۲ء

DECLAIRATION

I hereby undertake that my thesis entitled "**KAIFI AZMI: EK HAMAJEHAT FANKAR**" is my original and independent research and has not previously formed the basis for the award of any degree of M.Phil. and Ph.D. or any similar title or recognition in any other institution or university.

N Shaikh

Date: 27.12.2012 (Nasreenbanu Munirali Shaikh)
Place: Vadodara Reseach Scholar

सत्यं शिवं सुन्दरम्

Department of Persian, Arabic and Urdu
Faculty of Arts
The Maharaja Sayajirao University of Baroda
Vadodara-390002 (Gujarat)

CERTIFICATE

This is to certify that the work embodied in this thesis entitled **"KAIFI AZMI: EK HAMAJEHAT FANKAR"** in Urdu, is carried out by Nasreenbanu Munirali Shaikh in the Department of Persian, Arabic & Urdu, Faculty of Arts, The Maharaja Sayajirao University of Baroda,Vadodara(Gujarat), under my guidance and supervision.

The thesis submitted to the Maharaja Sayajirao University of Baroda, for the award of the **Doctor of Philosophy** in Urdu under comprises the result of original investigation carried out by the candidate and has not been submitted before, for the dissertation or thesis in any other institution or University

Anwar Zaheer

(Dr. Anwar Zaheer Ansari)
Guide & Supervisor

Dr. Anwar Zaheer Ansari
Associate Professor of Urdu
Dept.of Persian, Arabic & Urdu
Faculty of Arts
The Maharaja Sayajirao University of Baroda
VADODARA - 390 002

ہدیہء تشکّر

اللہ کے نام سے شروع جس پاک ذات نے مجھے علم وادب جیسے مضبوط وسائل کے ذریعہ ادبی خدمات دینے کی صلاحیات بخشی اور آیندہ بھی اسی طرح اسکی رحم اور عنایت سے مجھے راستہ ملتا جائے گا۔

اپنے والد مرحوم کی زندگانی میں اگر یہ تحقیقی مقالہ مکمل کرپاتی تو شاید کچھ قرض میرا ادا ہو جاتا، بحر حال اب ہی سہی کچھ حق تو ادا کر رہی ہوں۔

والدہ نسیم بانو جن کے ردِّ عمل اور حوصلہ افزا اقدامات نے میرے علمی شعور کو جلا بخشی انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ ایک دوست کی طرح دیا۔

اپنے شوہر ایڈوکیٹ اسمعیل کا اگر ساتھ نہ ہوتا تو میرے لئے مزید علم حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنی تمام مصروفیات کے، باوجود میرا ایک رفیق کی طرح ساتھ دیا۔

محترم مشتاق احمد صاحب (بڑے سر) جنہوں نے مجھے ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح چاہا اور ہر ہر قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کا شکریہ ادا کر کے ان کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتی۔

محترم بلال احمد صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہر حالات میں میرے کام کی رفتار کو کم ہونے یا رکنے نہ دیا،

پروفیسر مقصود احمد صدر شعبہ فارسی، عربی اور اُردو کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازہ۔

ڈاکٹر انور ظہر انصاری کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے نگراں بننا منظور کیا، اور میرے لئے اپنے علم کا در ہمیشہ کھلا رکھا، انہوں نے اپنی مثبت فکر، اپنی عنایت کے ذریعہ اس مقالے کو تکمیل تک لے جانے میں میری ہمہ جہت رہنمائی کی۔

آخر میں ان تمام کرم فرماؤں خصوصاً اپنے اساتذہ کی رہینِ منت ہوں جنہوں نے کسی بھی مرحلے میں میری ہمّت افزائی کی ہے۔

پیش لفظ

سرسید کی تحریک کے نقوش ہنوز لوگوں کے ذہنوں کا حصہ تھے کہ لندن کی یونیورسیٹی میں تعلیم پا رہے دو طلبہ کے ذریعے شروع ہوئی بیسویں صدی کے نصف اول کی ترقی پسند ادبی تحریک نے عوام کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لی۔ اس تحریک نے جہاں ایک طرف رومانیت کا طلسم توڑا تو دوسری جانب وطن سے محبت اور قومی خدمت کا جذبہ بیدار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعروں نے اپنے کلام کے ذریعے غلامی سے نجات اور سماجی تبدیلی کی خاطر انقلاب آفرین نغمات کے ذریعے عوام کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ذہنوں کو عزم و استقلال سے معمور کیا۔ جہد آزادی نے اقتصادی بہتری، سماجی خوشحالی اور سیاسی بیداری کا احساس دلایا۔ اس لیے ہمارے قلمقاروں نے صرف سیاسی پہلو کو ہی اجاگر نہیں کیا بلکہ ہر حال میں زندگی کی خوشگواری کو بھی مدنظر رکھا۔ علی سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، فیض احمد فیضؔ، مجروحؔ سلطانپوری، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، نیاز حیدر، کیفیؔ اعظمی وغیرہ شعراء قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا میں ساحرؔ لدھیانوی اور کیفیؔ اعظمی ادبی اور عوامی شعراء میں شمار ہوئے۔ فلموں سے ان کی وابستگی اس کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔

کیفی کی شاعری میں ان کی احتجاجی قوت کا مظاہرہ دیکھنے ملتا ہے۔ کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اساسی فکر ان کے فکری رجحان و میلان میں کچھ اس طرح جذب و پیوست ہو جاتی ہے کہ اس کی اپنی فطرت نفسیات اور تحریک کے فکر و نظر میں کچھ ایسا ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ان کو الگ کر کے دیکھ پانا ناممکن ہے۔ کیفیؔ اعظمی وہ ترقی پسند ہیں جنہوں نے شروعات سے ہی اپنے گھر کے ماحول میں شہادت امام حسینؓ اور انیسؔ کے مرثیوں کی گونج کے ساتھ ساتھ زمین دارانہ ماحول اور ظلم و جبر اور ضبط کرنے کے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے محسوس کیا بلکہ اس نظام سے انحراف کرتے ہوئے احتجاج کا راستہ اختیار کیا۔ عہد طفلی میں ہی انہوں نے اپنے اطراف کے ماحول میں فرسودگی و کہنہ پرستی، قید و پابندی، زمین داری، نظام کی سختیوں کا احساس کیا۔

نو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ترقی پسند ادبی تحریک کی گونج کانوں میں پڑی۔ لکھنؤ کے مشہور ومقبول مدرسے سلطان المدارس کے قانون کے خلاف آواز اٹھا کر کیفی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس عہد میں بھی اس تحریک میں شامل ہیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا بڑا مقصد ادب اور زندگی، ادب اور عوام، ادب اور مقصد کے رشتے کو مضبوط کرنا اور قدیم سماجی ومعاشرتی زندگی کو از سرنو تشکیل دینا تھا۔ سردار جعفری اور احتشام حسین کے ذریعے برائے اشاعت جب چند نظمیں سجاد ظہیر کی نظروں سے گزریں تو وہ حیران ہوئے بغیر رہ نہ سکے اور کیفی کے مجموعے جھنکار کے دیباچے میں لکھنے پر مجبور ہوگئے۔

> "جدید اردو شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے، ایک سرخ پھول"

کیفی کی شاعری قدیم وجدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا خیال ونصب العین صاف ومتعین، اس کا طرز بیان سیدھا اور براہ راست، اس کی تشبیہیں واستعارے نئے اور دلکش ہیں۔ وہ اشتراکیت کا پرجوش حامی ہے۔ سوویت روس کا گہرا دوست ہے۔ اور اب ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی ہے۔ اس خیال ومقصد حیات، اس کی زندگی اور عمل میں تضاد نہیں۔ اگر وہ انقلاب اور مزدور راج کے گن گاتا ہے تو اسے اس کا حق ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی محنت کشوں کی خدمت اور ان کی جدو جہد میں شرکت کے لئے وقف کر دی ہے۔ جدید دور کے ترقی پسند شاعر اسی قسم کے ہوں گے۔ وہ غالباً پہلے کے مقابلے میں تعداد کے لحاظ سے کم ہوں گے۔ لیکن ان کی گفتار وکردار میں ہم آہنگی کی وجہ سے ان کے کلام میں خلوص وسچائی کا عنصر پہلے سے زیادہ ہو گا۔

کیفی صاحب کی شاعری کی تمام تر خصوصیات کو ابھارنے کے مقصد سے میں نے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے کیفی اعظمی ایک ہمہ جہت فنکار کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان کوتاہیوں کی روشنی میں کیفی صاحب اور ان کے فکر وفن کو نئے آہنگ سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ کیفی صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں غور وفکر کی نئی راہیں کھل سکیں۔

اس تحقیقی مقالے کو مندرجہ ذیل ابواب میں منقسیم کیا گیا ہے اور ان کے تحت کیفی صاحب کی فکری، جہتوں اور فنی پہلوؤں پر بحث کر کے نتائج نکالے گئے ہیں۔

باب اول	بیسویں صدی کی سماجی اور تہذیبی اقدار اور ادبی صورت
باب دوم	کیفی اعظمی کی سوانح حیات
باب سوم	کیفی اعظمی کی غزل گوئی
باب چہارم	کیفی اعظمی کی نظم نگاری
باب پنجم	کیفی اعظمی بحیثیت فلمی شاعر
باب ششم	کیفی اعظمی ایک کثیر الجہات قلمکار

ماحصل

کتابیات

باب اول

بیسویں صدی کی سماجی اور تہذیبی اقدار اور ادبی صورت

سماجی اور تہذیبی اقدار دوران بیسویں صدی

اس باب میں بیسویں صدی کی سماجی اور تہذیبی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کیفی اعظمی نے جس ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں اور پرورش و تربیت پائی، اس ضمن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور آزادیِ ہندوستان کی کوشش سے وجود میں آنے والے نئے خیالات، نئی سماجی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن کا براہ راست اثر کیفی صاحب کی زندگی پر پڑا۔ ترقی پسند تحریک کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ جس نے تحریک آزادی کو بلا واسطہ یا بالواسطہ متاثر کیا ہے۔ تحریک آزادی اور اس وقت کی سماجی اور تہذیبی حالات سے کیفی اعظمی بھی متاثر ہوئے۔ جس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ کیفی صاحب کا لب ولہجہ باغیانہ، تیور اور انقلابی افکار و خیالات کے نقوش آج بھی ان کے کلام کو جلا بخشتے ہیں۔

کیفی صاحب کے افکار و خیالات، نظریات و موضوعات کا جائزہ اس باب میں لیا گیا ہے جو بیسویں صدی کے سماجی و سیاسی اور فکری و تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کے عہد میں منظر عام پر آئے۔ نیز شاعری میں جو ہیئتی تجربے ہوئے اور آزاد و معریٰ اور نثری نظم اور سانیٹ اور گیت کی اصناف وجود میں آئیں ان سب کی روشنی میں بیسویں صدی کے ادبی رجحانات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ضمن میں فیض احمد فیض سے لے کر میراجی کے ہئیتی اجتہاد اور موضوعی تغیر و تبدل کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ شاعری کے اس رجحان کا بھی کیفی صاحب پر کم و بیش اثر پایا جاتا ہے۔ پھر حب الوطنی کا تصور اور قومی یک جہتی کے جذبہ و احساس کے علاوہ ترقی پسند تحریک کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جس نے کیفی صاحب کی شاعری کو نئے خیالات بخشے اور ان کے افکار و ادبی شعور کو نئی سمتیں دستیاب کیں۔

باب دوم

کیفی اعظمی کی سوانح حیات

اس باب میں کیفی صاحب، ان کے خاندان، ان کا تربیتی ماحول نیز اس عہد کے سماجی و تہذیبی حالات پر بالخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ اس میں کیفی صاحب کی ولادت، ان کے والدین اور بھائی بہن کا ذکر ان کے باہمی تنازعات کے ساتھ آیا ہے۔ کیوں کہ ان حالات سے کیفی صاحب کی شروعاتی زندگی شدید طور سے متاثر ہوئی ہے۔ ساتھ ساتھ آپ کی تعلیم اور روزگار سے متعلق ذکر کیا گیا ہے۔ جس کا سیدھا اثر کیفی صاحب کی شخصیت اور ان کے افکار پر پڑا ہے۔

اردو کی ترقی پسند تحریک سے ان کا گہرہ تعلق تھا۔ اور وہ اس کے اہم ستون خیال کیے جاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے بھی سرگرم رکن تھے۔ اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری عارض و کاکل کی حکایت اور گل و بلبل کا تذکرہ نہیں رہی بلکہ وہ زندگی اور سماج کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور اس کا احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ گھر میں انیس کے کلام اور حضرت امام حسین کے کردار کے مطالعہ اور گھر کے باہر ملک و ملت کا ماحول، ہر طرف آزادی کے چرچے، نغمے اور پربھات پھیریاں۔ ان تمام چیزوں نے کیفی صاحب کے دل و دماغ پر گہرہ اثر ڈالا۔ اور وہ اثرات تاحیات مرتب رہے۔ آخر میں کیفی صاحب کی فلمی زندگی کی تفصیلی روداد قلم بند کی گئی ہے تاکہ اس روشنی میں ان کی فلمی شاعری کی صحیح قدر و قیمت طے کی جاسکے۔

باب سوم

کیفی اعظمی کی غزل گوئی

اس باب میں کیفی اعظمی کی غزلوں کے علاوہ ان فردیات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جو ان کے مجموعۂ کلام " آوارہ سجدے " میں شامل ہیں۔ حالانکہ غزلوں میں تقریباً وہی نظریات و خیالات کارفرما ہیں جو ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور ان کی غزلوں کے موضوعات بھی کم و بیش وہی ہیں جو نظموں میں

جاری وساری ہیں۔ زمانے کی ناقدری کی شکایت ہو یا سماجی وتہذیبی قدروں کی شکایت ہو یا سماجی وتہذیبی قدروں کی پامالی کی فکر، عوامی زندگی کے مسائل کا احساس ہو یا تقسیم ملک کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کا زور، کیفؔی صاحب نے ہر معاملے کی باریکی کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے رنج والم کا اظہار کیا ہے۔ زندگی کے ان معاملات ومسائل کو شدت سے محسوس کیا ہے اور باوجودیکہ کیفؔی صاحب کی غزلوں اور نظموں کے موضوعات میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن کیفؔی اعظمی کی غزلیں، لب ولہجے اور انداز بیان کے لحاظ سے روایتی غزلوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس باب میں کیفؔی صاحب کے گذشتہ ابواب بالخصوص ان کی صحافت کو پیش نظر رکھ کر بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز معاصر غزل گو شعراء کی غزلوں کے زیر نظر ہیئت اور موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم

کیفؔی اعظمی کی نظم نگاری

اس باب میں کیفؔی صاحب کے مجموعے "جھنکار"، "آخری شب" اور "آوارہ سجدے" کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان کے کلام کے گذشتہ ابواب کے حوالے سے کہی جائیں تاکہ زمانے کے تغیر وتبدل کا پرتو بھی منعکش ہو سکے اور ان سیاسی وسماجی اقدار اور ادبی ماحول کے اثرات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن میں ان کی ذہنی وفطری نشو ونما ہوئی اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان حالات وماحول کے اثرات ان کے افکار وخیالات اور ان کی شاعری پر کسی حد تک مرتسم ہوئے ہیں۔ کیونکہ کیفؔی نے عورتوں کے سماجی استحصال، محنت کش عوام کی پسماندگی، طبقاتی کش مکش، مذہبی منافرت، فرقہ واریت اور نسلی امتیازات کے خلاف احتجاجی رویہ اپنایا ہے۔ جو سماجی وتہذیبی قدروں ہی کو پامال نہیں کر رہے بلکہ عام انسانی زندگی کو بھی دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اسی طرح کیفؔی کے بین الاقوامی سوجھ بوجھ کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور جنگ اور امن سے متعلق ان کے نظریات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ جنہوں نے ان کی فکر کو جھنجھوڑا اور ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے۔

باب پنجم

کیفی اعظمی: بہ حیثیت فلمی شاعر

اس باب میں کیفی کی فلمی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فلموں کے لیے گیت لکھنا ایک زمانے تک توہین ادب سمجھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ وہ آیا جب ترقی پسند شاعروں کا ایک گروہ بمبئی جا پہنچا اور ان کے قلم سے نکلے نغموں اور گیتوں نے فلمی دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ ایسے ہی پر آشوب ماحول میں کیفی صاحب کے فلمی گیتوں نے دھوم مچائی۔ کیفی صاحب کے فلمی گیتوں کا مجموعہ "میری آواز سنو" ۱۹۷۴ء پہلی بار شائع ہوا۔ کیفی صاحب نے اپنی شاعرانہ فطرے کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ "حقیقت" "کاغذ کے پھول" "گرم ہوا" "پاکیزہ" فلم کے گیت کیفی صاحب کے جادوئی قلم کا ایک تحفہ ہے۔ کیفی صاحب نے فلم کو نظریات و خیالات و تجربات و مشاہدات کے اظہار کا بہترین اور اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس باب میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انہوں نے ان ذرائع سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔

باب ششم

کیفی اعظمی ایک کثیر الجہات شاعر

اس باب میں کیفی صاحب کی ان دیگر اصناف کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کی غزلیہ، نظمیہ اور فلمی شاعری کے علاوہ ہیں۔ یہاں پر کیفی اعظمی کی شاعری کے دیگر ادوار کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ جہاں کیفی صاحب کہیں عوامی شاعر ہیں تو کہیں انقلابی شاعر۔ کہیں وہ اپنے کلام کے ذریعے سماج کے فرسودہ رسومات پر طنز کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں بیداری کا سبق دیتے ہیں۔ کہیں وہ دردمند اور حقیقت پسند شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں تو کہیں رومانی و انقلابی شاعر کے طور پر۔ اس طرح اس باب میں کیفی صاحب کی شاعری کے بدلتے رنگ اور پیغام کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مطالعے میں دوسرے ہم عصر شعراء کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تا کہ ان ادوار سے متعلق کیفی اعظمی کے فکر و فن کا ادراک کیا جا سکے۔

فہرست

باب	مضمون	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	2 - 8
باب اول	بیسویں صدی کی سماجی اور تہذیبی اقدار اور ادبی صورت	9 - 22
باب دوم	کیفی اعظمی کی سوانح حیات	23 - 82
باب سوم	کیفی اعظمی کی غزل گوئی	83 - 104
باب چہارم	کیفی اعظمی کی نظم نگاری	105 - 142
باب پنجم	کیفی اعظمی بحیثیت فلمی شاعر	143 - 197
باب ششم	کیفی اعظمی ایک کثیرالجہات قلمکار	198 - 219
	ماحصل	220 - 222
	کتابیات	223 - 225

بابِ اوّل

بیسویں صدی کی سماجی اور تہذیبی اقدار اور ادبی صورت

آزادی کے بعد جس زمانے میں مسلمانوں کے مجموعی حالات ناگفتہ تھے اور زندگی کے ہر شبعہ میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی، سرسید اور اِن کے افقاء کار نے اِس ڈُبتی ہوئی کشتی کا سنبھالا۔ اِن لوگوں کی گہری نظر سیاست، تعلیم، مذہب، معاشرتی اصلح زبان وادب کی ترقی سب پر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر قوم کو زندہ رکھنا ہے تو وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا لازمی ہے۔ اور اس قوم کو مغرب کی تہذیب روایت میں ایسے عناصر جو قوم کے مسائل کو حل کرنے میں معادن ہوں ان کو قبول کر لینا چاہیئے۔ سرسید کی یہی تحریک تھی۔ اس کی بنیاد فراخ دلی اور عقلیت پسندی پر تھی۔ اس تحریک کی ترویج کے لئے انہوں نے تہذب الاخلاق رسالہ جاری کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی، جو آج مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ سرسید نے اپنی تحریروں کے ذریعہ روایت پرستی کے خلاف مقصدی اور مفید ادب کی تخلیق کی، جس نے اردو زبان وادب، شاعری وتنقید کا رُخ ہی بدل دیا۔ ان کے ساتھیوں میں محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالؔی اور مولانا شبلی قابل ذکر ہیں۔ یہ زمانہ ۱۹۱۴ء کا ہے۔ سرسید تحریک نے اردو شعرا اور مصنفین کو نیا ادبی نقطہ نظر دیا۔ موضوعات کو وسعت دی اور بیان کی سلاست اور سادگی پر زور دیا۔ مندرجہ بالا افقا سرسید کے علاوہ وقار الملک، ذکا اللہ، محسن الملک، سید علی بلگراتی نے گھسے پٹے موضوعات کو ترک کر کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور تاریخی اہمیت کے موضوعات کی طرف توجہ دی۔

برصغیر کی اصلاحی اور تعمیری تحریکات میں اخبار اور رسالوں نے بڑا حصّہ لیا۔ ان میں مولوی محمد باقر کے اردو اخبار کے علاوہ "محبّ وطن" "صادق الاخبار" اور "کوہ نور" وغیرہ اخبار و رسالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا ذکر بھی ضروری ہے، کیونکہ اس اخبار نے پہلی مرتبہ۔ لفظ قوم کے بارے میں یہ لکھا کہ ایک خاص ملک میں رہنے والوں کو ایک قوم شمار کیا جائے۔

اس زمانے میں انگریزوں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کی بنا پر ایک نئے نظامِ تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے جدید مغربی علوم اور زبان و ادب کے مطالعہ کی راہ پیدا ہوئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس تحریک نے اہل وطن کے دل و دماغ کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں عدم تعاون سودیشی تحریک اور پھر سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ ان سب میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ اسی تحریک کے نتیجے میں حکومت اور سیاسی کارکنوں میں ٹکراو پیدا ہوا، اور جلیاں والا باغ کا وہ خونی حادثہ پیش آیا، جو انگریزوں کے دامن پر ایسا بدنما داغ بن گیا جو تا قیامت نہ چھوٹے گا۔ اس تحریک کے قائدین، اخبار نویس، شعراء اور نثر نگار سب تھے۔ ان میں مدیر بلال مولانا ابوالکلام آزاد،

مولانا ظفر علی خان، (مدیر انقلاب) مولانا محمد علی (مدی ہمدرد) کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اس تحریک نے جو شعراء پیدا کیے ان میں چکبست، جگت موہن لال رواں، جوش ملیح آبادی اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ تھے۔

اس جدوجہد کا انجام بہت ہی علمناک صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک ہندوستان اور پاکستان خود مختار حکومتوں میں منقسم ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد جو خونریزی اور ہجرت کے درمیان جو قتل و غارتگیری رونما ہوئی اس کا شدید اثر اردو ادب و شاعری پر پڑا، اس زمانے کے افسانے اور ناول ملک کی ششتھونی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں، ایک دوسرا دور اردو میں انقلابی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور مارکسی ادب و تنقید کے رجحانات ایک مستقل تحریک کی صورت میں سامنے آئے، اس میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، مجاز، فیض اور کرشن چندر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

سماجی بیداری کے حالات کو بہتر بنایا۔ عورت گھر کی چاردیواری سے باہر نکل کر مرد کے دوش بدوش کارزارِ حیات میں شریک ہوئی۔ مزدوروں اور کسانوں کی حالت بھی پہلے سے بہتر ہوئی۔ لیکن سرمایہ

داروں کی گرفت ابھی ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ سماج میں رشوت، ذخیرہ اندوزی اور گرانی کو ابھی مکمل طریقہ پر نہیں ختم نہیں کیا جا سکا۔ ان حالات کا اثر بھی اردو ادب پر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا علمیہ اردو ادب کا یہ ہے کہ حکومت نے بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اور اردو کو اس کا جائز حق نہیں دیا گیا۔ اگر کہیں اردو کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا بھی جاتا ہے تو فرقہ پرست قومیں فوراً اس کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود اردو ایک مقبول خاص و عام زبان ہے۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۸ء تک کا دور اصلاح پسندی حب الوطنی اور قومیت پرستی کے دور کے نام سے عبارت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ زمانہ سماجی اور سیاسی اعتبار سے عام اصلح پسندی، حب الوطنی، ہندوستانیوں میں اپنی قومیت اور اپنے سیاسی حقوق کے احساس پیدا ہونے کا زمانہ ہے،

قدیم ہندوستان کے عظیم علمی و ادبی کارناموں کی بازیافت اور ان کی تشہیر اور پھر بیسوں صدی کی ابتداء میں روس پر جاپان کی فتح نے انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے ایشیائی جذبے کو اُبھارنے اور ان کا احساس کمتری کو دور کرنے میں مدد دی، بعد میں روس کے اشتراکی انقلاب سے

ہندوستانیوں کے جذبہ، خود مختاری کو تقویت پہونچی ، اقتصادی اعتبار سے ہندوستان کی پرانی صنعتیں ختم ہونے لگیں۔ اس کی وجہ سے انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بڑھتے ہوئے اثرات اور انگریزی مصنوعات کی درآمد تھی۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی کی ابتدا اور دیگر سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے ایک نیا طبقہ جنم لے رہا تھا۔ جس کی آرزوئیں اور ارادے بلکہ خود اس کی بقا کا دارو مدار ملک کے نظم ونسق کے مزید استحکام پر تھا۔

"ادب زندگی کی تخلیقی ترجمانی اور تہذیبی زندگی کا نمایاں شعبہ ہے۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی ان تبدیلیوں کا اثر ظاہر ہوا۔ اُنیسویں صدی کے نصف اول تک اردو میں قابل فخر شعری سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ جدید اردو نثر کی بنیادیں بھی رکھی جا چکی تھیں۔ شعر و ادب کو فروغ ملا تھا۔ اس کے موضوعات زیاتر مذہب، تصوف، اخلاق و عشق تھے۔ اور اس میں بازار، خانقاہ اور دربار تینوں کی دُھوپ چھاؤں نظر آتی تھی"[۱]

اردو کے دو اہم مراکز لکھنو اور دہلی جو تاراج و خراب ہو چکے تھے جلد ہی سنبھلنے لگے، دیسی ریاستوں نے اردو ادب کے فروغ میں حصّہ لیا۔ اور اس میں اور زیادہ سدھراؤ، نکھار، توانائی اور ادبی موضوعات میں تنوع اور وسعت

پیدا ہوئی۔ اہم بات یہ ہے کہ اب اردو تہذیبی زبان بن گئی تھی۔

اس دور کے ادب کو انقلاب اور کسی حد تک اس کا ردِّ عمل (اکبرؔ) معروضیت پسندی، حقیقت نگاری (ادبی مقصدیت) کی ابتداء اور اس کے اثرات مرتب ہونے کا دور کہنا چاہیئے۔ اس دور کے ادیبوں شاعروں (سر سید، حالیؔ، آزاد، نذیر احمد، شبلی، اسمعیلؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، چکبست، اور پریم چند وغیرہ) نے اردو ادب کے خزانے کو نئے اسالیت اور نئے اصناف ادب کے اضافے سے مالا مال کر دیا۔ ان تمام نے محنت، خلوص اور نیک نیتی سے کام لیکے حقیقت نگاری (ادبی مقصدیت) اور فنکارانہ ترقی پسندی کو اپنا شعار بنایا، اور بعد کے آنے والوں کے لئے روشن خیالی کے دروازے کھول دیئے۔ ملک میں نظم ونسق کے استحکام، طباعت، ذرائع آمدورفت اور رسل ورسائل کی مزید آسانیوں سے مغرب سے متاثر ادب کی عام اشاعت ہونے لگی۔

''۱۹۱۸ء کے اختتام تک اردو شعر وادب فارغ البال طبقہ کی طبقہ ذہنی تفریح کا نام نہیں رہا تھا۔ جیسا کہ کسی حد تک پرانے جاگردارانہ نظام میں تھا۔ جبکہ شعراء کی معاش کا دارومدار زیادہ تر رئیسوں کی خوشنودی پر تھا۔ اب اردو ادب متوسط طبقہ کی محرومی وسرشاری، دُکھ درد، رنج وراحت اور نغمہ ونالہ کی داستان بن گیا تھا'' ۲؎

ادب وشعر کو زندگی سے قریب لانے کی یہ اردو ادب کی پہلی شعوری کوشش تھی۔ اور نہایت کامیاب تھی۔ سرسید، آزاد، حالؔی، نذیر احمد، شبلی اور اکبر کو جدید اردو شعر و ادب میں اسی اعتبار سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان کو اپنے ماضی سے لگاؤ تھا۔ وہ پرانے ادب کے رمز شناس تھے۔ اور اس کا احترام کرتے تھے۔ لیکن قدامت کے مقابلے میں نئے سماجی حقائق سے آگاہی پر زور دیتے تھے۔ وہ عقلیت پسند تھے مگر مذہب ان کی اعلیٰ ترین قدر تھی جسے چھوڑنے پر وہ کسی طرح تیار نہ تھے۔ یہاں فرداً فرداً ان ادیبوں اور شاعروں کی تخلیق کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ البتہ اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ان مصنفین کے کارناموں میں اسلام کی گذشتہ شان و شوکت سے سرشاری کا جذبہ اور اُن کا خلوص نمایاں ہے۔

”۱۹۱۸ء کے قابل ذکر شعراہ کی فہرست میں ایک اور اہم نام ڈاکڑ سر محمد اقبال کا ہے۔ ان کے کلام میں حب الاوطنی اور قومیت پرستی کی سرشاری صاف نمایاں تھی۔ مگر اس قومیت پرستی میں اسلامی تاریخ سے اثر پزیری بھی صاف جھلکنے لگی تھی۔ عالمی اسلامی حالات وتہذیبی ارتقاء کے پیش نظر قومی شاعری کی ایک ذیلی شاخ یعنی مسلمانوں کی علمی شاعری وجود میں آئی۔ حالؔی باوجود وطنیت سے سرشاری کے مّلت کے حال سے متاثر ہوکر،

مسدس مدو جزر اسلام'' لکھ چکے تھے۔ اکبر کی ظریفانہ شاعری کا محرک مذہبی جذبہ بھی تھا۔ شبلی بھی ملی نظمیں لکھ رہے تھے۔ اقبال نے ملی شاعری کو عروج تک پہنچایا۔ انہوں نے مادیت کے مقابلے میں روحانیت پر زور دیا، اور ایک فلسفۂ تغیر حیات پیش کیا۔ جس میں تغیر و حرکت، سعی و عمل کو رگ جاں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں حیات انسانی کا مقصد خود کو غیر خود میں فنا کرنا نہیں بلکہ اثبات خودی ہے۔ وہ خدا کا تصور بہ حیثیت ذات مطلق کے کرتے ہیں۔ جو خودی کی کامل مثال ہے''[۳]

اردو ادب میں اصلاح پسندی یا ادبی مقصودیت کے دور کے ساتھ ساتھ ایک رجحان اور نشونما پایا وہ ہے رومانیت کا رجحان۔ ایسی رومانیت جس پر عقلیت کی چھاپ بھی ہو، جس میں جذبات کی فراوانی تو ہو مگر سماجی فکر سے بے نیاز بھی نہ ہو۔ یہ رجحان بیسویں صدی کی دوسری دہائی کی پیداوار ہے، جب ہمارے شاعر اور ادیبوں کی نظر میں ہندوستانی تہذیب اور اسلام کی گذشتہ شان و شوکت بھی تھی اور ساتھ ہی سماجی اصلاحات اور سیاسی حالات سے متاثر ہو کر سیاسی آزادی کی لگن اور جوش اور کچھ کر گزرنے کا عزم و ارادہ بھی بقول احتشام حسین:

''بیسویں کے آتے آتے آزادی کی خواہش اور مغربی اثرات نے عمل کو دُنیا سے دُور ایک انتہا پسندانہ رومانوی اور تخلیقی اندازِ نظر بھی پیدا کر دیا جو کسی کے یہاں تخلیقی رنگین بیانی اور والہانہ گمشدگی کے رنگ میں رونما تھی۔ جو زنجیریں واقعی زندگی میں نہیں ٹوٹ سکتی تھیں، وہ خیالوں میں ٹوٹنے لگی، اور تصوّر کی مینا کاریوں سے محدود زندگی ہی میں نئے چمن کھلنے لگے''[۱۳]

جہاں تک ہندوستان میں سیاسی سماجی اور قومی بیداری کا تعلق ہے اس کا آغاز اُنیسویں صدی کے شروع میں ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں عوامی ذہنی بیداری کے لیے رمذہبی تحریکات پیش رفت کر چکی تھیں۔ ان مذہبی تحریکات نے عوام کی ذہنی و فکری سطح کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ آزادی کا مفہوم سمجھنے لگے تھے۔ اور اس کی اہمیت سے واقف ہو چکے تھے۔

یہ جذبہ ہندوستان میں انگریزوں کی سازشوں کے خلاف ایک ذہنی ردِ عمل کے طور پر اُبھرا تھا۔ کیونکہ سارے ملک میں عیسائی مشنریاں مذہب کی ترویج و اشاعت کے لئے سرگرم عمل تھیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کی مراکز قائم ہو چکے تھے۔ تبدیلی مذہب کو اپنا نصب العین بنا کر ملک کے کونے کونے میں عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی اور کوشاں تھے۔ عیش و نشاط کی

سہولتیں، سماج میں باعزت مقام ومرتبہ کی لالچ کے سہارے انہیں اپنے مقصد میں بڑی کامیابی حاصل ہورہی تھی۔ بقول احتشام حسین:

> ''فوجوں میں عہدوں کی ترقی کا انحصار بہت کچھ مذہب کی تبدیلی پر رہ گیا تھا۔ اور یہ تحریک ایسی نہ تھی جس کا شکار بہت سے لوگ نہ ہو جاتے ہوں۔ مشن کے پادریوں کو عام اجازت تھی کے وہ وقتاً فوقتاً فوجی چھاونیوں میں جاکر دینِ مسیح کی خوبیاں بیان کریں اور تبدیلئ مذہب پر اپنی اور دینوی فلاح کی بشارت دیں''[۵]

۱۸۵۷ء کی جنگ ہندوں اور مسلمانوں نے مل کر لڑی تھی جس کی بنا پر انگریزوں کا یقین کامل ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان میں حکومت قائم کرنا ہے تو ہندو اور مسلمان دونوں کے بیچ منافرت پیدا کر دینا لازمی ہوگا۔ اس نظریے کے تحت ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء کے کانگریس کے اجلاس میں دادا بھائی نوروجی نے پہلی بار سوراج حاصل کرنے کے تصور کو واضع کیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں مسلم لیگ میں اعلیٰ طبقے کے مسلمان اور زمیندار شامل ہوئے۔ لیکن جلد ہی یہ بھی کانگریس کی طرح انگریزوں کے خلاف قومی تحریک میں حصہ

لینے لگی۔ اور ۱۹۱۳ء مسلم لیگ نے بھی سوراج حاصل کرنا اپنا مقصد بنالیا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان لکھنؤ معاہدہ ہوا۔ جس میں جداگانہ انتخاب کو تسلیم کرلیا گیا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ دونوں پارٹیوں کا مقصد ہندوستان کو اعلیٰ درجہ دلانا ہے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک دونوں پارٹیوں میں خوشگوار تعلقات قائم رہے، لیکن ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ معاہدہ مسترد کردیا گیا۔ اور دونوں پارٹیوں میں اختلاف شروع ہوگیا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک ملک پر سیاسی انجماد طاری رہا لیکن فرقہ پرستی کو فروغ ملا۔ ہندمہاسبھا اور مسلم لیگ میدان میں اُتر آئیں، سوراج پارٹی بھی فرقہ پرستی کا شکار ہوگئی۔ گاندھی جی نے ان فسادات کے خلاف مولانا محمد علی کے مکان پر ۲۱ دن کا ورت رکھا، لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

۱۹۱۷ء میں روس میں زبردست انقلاب آچکا تھا۔ اور مزدوروں کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ اس کے اثرات پوری دنیا نے قبول کئے، ہندوستانی سیاست پر بھی اس کا گہرا اثرات مرتسم ہوئے اور کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ کانگریس کے اندر بھی جواہرلال نہرو، سبھاش چندر بوس اشتراکیت سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں جواہرلال نہر کانگریس کے صدر اور سبھاش چندر

بوس سیکریٹری منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں گاندھی جی شریک نہیں ہوئے۔ اس لئے کانگریس نے مکمل آزادی حاصل کرنا اپنا نصب العین قرار دیا۔ گاندھی جی نے اس کی مذمت کی۔ اس اجلاس سے سوراج کا مفہوم مکمل آزادی میں تبدیل ہوگیا۔ اور ہندوستانی سیاست میں مساوات اور سوشلزم کی گونج سنائی دینے لگی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو پہلا یوم آزادی منایا گیا۔

کانگریس کے کراچی اجلاس میں کانگریس نے جمہوری طریقے سے اپنی راہ عمل طے کرنے کا اعلان کیا، جس میں سوشلسٹ رجحانات کا عکس تھا۔ کمیونسٹ پارٹی سارے ملک میں روز بروز مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی ۱۹۳۴ء میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی قائم ہوگئی۔ جس کی بنیاد جے پرکاش نرائن اور آچاریہ نریندر دیو نے رکھی۔

اس وقت جو ترقی پسند خیالات سامنے آرہے تھے ان کی بنیاد ایک اہم اور نتیجہ خیز تاریخی واقعہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب تھا۔ یہ انقلاب دراصل مارکسی جدلیاتی مادیت کے نظرے کا ایک عملی مظہر اور اشتراکیت کی تفسیر تھا۔ جس نے جدید ذہن اور شعر و ادب کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان بھی اشتراکی نظریات سے پوری طرح متاثر ہوا۔ یہاں سیاسی حالات نے اشتراکی تحریک کے لئے میدان ہموار کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرس ہوئی اور ہندوستان کی سرزمیں پر اشتراکی نظریہ کی اشاعت کے لئے اجتماعی کوششیں شروع ہوئیں۔ اور شعروادب میں اشتراکی خیالات واضع طور پر اُن تمام قلمکاروں کی تحریر کے نقوش جو ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفیں کے قیام کے بعد اس کی ادبی تحریق سے وابستہ ہوئے تھے، ابھرنا شروع ہوئے۔

اس طرح ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کی رگوں میں گاندھیزم، کمیونزم، اور سوشلزم خون بن کر دوڑنے لگا۔ اور ہندوستان کی کوئی تحریک ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

۱۹۳۵ء تک اردو ادب جن وسعتوں سے ہم کنار ہوا اور جن انقلابی تبدیلیوں سے گزرا وہ یقیناً حیرت انگیز تھیں۔ اردو ادب کی پوری تاریخ میں پہلے نہ تو کبھی ایسی تبدیلیاں ہوئی تھیں اور نہ ہی اتنی برق رفتاری کے ساتھ اس نے ترقی کی منزلیں ہی طے کی تھیں۔

حواشی:

(۱) آل احمد سرور، فکر و نظر ص ۸۱، بحوالہ آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ۲۳۔

(۲) ایضاً ص ۸۲، بحوالہ محمد ذاکر آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ایجوکیشن پبلیشنگ دہلی ۲۵۔

(۳) Lumby متذکرہ ص ۱۱۹ تا ۱۲۲ و Mosley متذکرہ ص ۱۱، ۳۴ تا ۴۰ اور ۲۰۳ بحوالہ ایضاً ۱۲۶

(۴) احتشام حسین، علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ نمبر ۴۰ء ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۴ء ص ۱۱۲ بحوالہ ایضاً ۲۷۔

(۵) ڈاکٹر وسیم انور تاریخی سیاسی وسماجی پس منظر کیفی اعظمی: شخصیت شاعری اور عہد ص ۱۷۹۔

باب دوم

کیفی اعظمی کی سوانح حیات

اعظم گڑھ، یو۔ پی۔ کے گاؤں مجواں کے مسلم شیعہ زمیندار گھرانے میں تولد ہوئے لڑکے کا اسم گرامی اطہر حسین رضوی رکھا گیا۔ جو بعد میں کیفی اعظمی کے نام سے مشہور ہوا۔ کیفی اعظمی اپنی تاریخ ولادت کے سلسلے میں اپنے مجموعہ ء کلام 'کیفیات' میں رقمطراز ہیں: ''میں اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں محکوم ہندوستان میں پیدا ہوا، آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا، اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا۔''[۱]

کیفی اعظمی کے دادا میر عطا حسین رضوی مقبول زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک وملت سے سچی محبت کرتے تھے۔ اپنے دادا مرحوم کے وطن سے محبت اور عقلی شعور کو کیفی صاحب کیفیات میں یوں تحریر کرتے ہیں

''بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کروائی تو ہمارے گاؤں میں نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام آیا کہ جو، گیہوں بونا چھوڑ دو نیل کی کھیتی شروع کرو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کر دے گی۔ میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انہوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت وتجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے۔ اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا

چاہتی ہے۔ اس لیے چپکے چپکے ان بیجوں کو بونے سے پہلے بھون ڈالو۔ بھنے ہوئے بیج اگ نہیں سکتے اور جب وہ اگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیت کے لیے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ دادا مرحوم نے خود یہی کیا۔ اور ان کے مشورہ پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ جب نیل کے بیج اگے نہیں تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے۔ لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہو گئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈالے تھے۔ دادا مرحوم پر مقدمہ چلا ارجائداد ضبط ہوئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا۔'' [۲]

کیفی صاحب کے والد کا نام سید فتح حسین رضوی تھا۔ وہ خود بھی شاعر تھے، ان کی شخصیت ادب دوست کی تھی۔ آپ کی والدہ کا نام گرامی سیدہ حفیظ انساء عرف کنیز فاطمہ تھا۔ سید فتح حسین رضوی اور کنیز فاطمہ کی آٹھ اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹیوں میں قمر انساء، محسنہ، آمنہ اور واجدہ تمامی بہنیں یکے بعد دیگرے دق جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر انتقال فرما گئیں۔ ان کے علاج اور انتقال کے دوران کی کشمکش نے کیفی کو بہت متاثر کیا۔ ان کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے کیفی لکھتے ہیں کہ:

''اماں جہاں اپنی کسی بیٹی کو لے کر علاج کے لئے جاتیں، مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا۔ اس طرح میں نے اس کچی عمر میں اپنے چاروں طرف بیماریوں اور دکھوں کا ہجوم دیکھا۔ اور میں دھیرے دھیرے غم پسند ہوتا گیا۔'' [۳]

کیفی صاحب کے والد تعلیم اور شاعری سے حد درجہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اس جذبے کے پیش نظر انہوں نے اپنے چاروں بیٹوں کو بہترین تعلیم سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کیفی صاحب کے سب سے بڑے بھائی ظفر حسین صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپ کا تخلص مجروحؔ تھا۔ منجھلے بھائی یوسف حسین کا تخلص بیتابؔ، اور تیسرے بھائی شبیر حسین کا تخلص وفاؔ تھا۔ اس وقت اچھے شاعروں کی فہرست میں شمار ہوتے تھے۔ اس طرح آپ کے گھر کی فضا ادب اور شعر و شاعری سے لبریز تھی۔ کیفی بچپن ہی سے صبر و استقلال کے حامی تھے۔ شکایت کرنا آپ کی فطرت میں نہیں تھا۔ آپ کے صبر و استقلال کو ظاہر کرتا ایک واقعہ ان کی ہمدرد و غم گسار اہلیہ شوکت اعظمی نے یوں بیان کیا ہے لکھتی ہیں:

''چھ سات سال کی عمر میں ایک بار یکہ پر گاؤں جاتے ہوئے اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ یکہ کے ساتھ لٹکتا ہوا ایک میل چلا گیا۔ لیکن اس کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ جب پیچھے سے آتے ہوئے ایک شخص نے دیکھا تب وہ چلایا اور یکہ رکا، اور اس بچے کی جان بچی۔ پیٹ اور ٹانگیں چھل چکی تھیں۔'' [۴]

کیفی صاحب کے والد نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسیٹی میں تعلیم دلوائی اور باقی کو لکھنو میں۔ کیفی صاحب کے والد کی تربیت اور انداز فکر کا ایک واقعہ کیفی صاحب بظاہر خود پیش کرتے ہیں۔

''بابو خاں بیٹھے ہوئے تھے ابا کے ساتھ میں باہر سے کہیں گلی ڈنڈا کھیل کر آرہا تھا۔ میں دیکھا اور جھٹ سے گھر میں چلا گیا۔ ان کو سلام نہیں کیا۔ ابا کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سامنے کسی کے نہیں ڈانٹتے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو ابا نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ، بھئی وہ تمہارے بابو چچا بیٹھے تھے، تم نے سلام کیوں نہیں کیا؟ میں نے کہا میں بھول گیا۔ کہا، ہاں ہو جاتی ہے آدمی سے بھول۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ اچھا ایسا کرو کہ یہاں جتنے تاڑ ہیں، سب کو آداب کرو۔ ہم جھک جھک کر خوب آداب کر رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔ اور وہ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ خوب گھنٹوں مشق کروائی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اب تک کوئی بزرگ آجائے تو ہاتھ اٹھے بغیر نہیں رہتا۔'' [۵]

کیفی صاحب کے والد اپنی چار چار بیٹیوں کے انتقال کی وجہ سے ہر اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ وہ ایسا سوچتے کہ انہوں نے اپنے تینوں صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم سے سرفراز کروایا اور یہ ان سے گناہ ہوا۔ انہوں نے مغربی طرز کو

برتری دی اور اسی گناہ کا عذاب یا عتاب ان پر نازل ہوا ہے۔ جس نے ان کی چاروں بیٹیوں کو نگل لیا۔ انگریزی اسکولوں میں فاتحہ پڑھنا نہیں سکھایا جاتا اس لیے ان کے مرنے کے بعد کوئی فاتحہ پڑھنے والا تک نہ ہوگا۔ اس روایتی سوچ کے زیر اثر اس درد کو کم کرنے کے لیے کیفی صاحب کے والد نے اپنے چھوٹے بیٹے یعنی کیفی اعظمی کو دینی تعلیم دلوانے کی غرض سے اس وقت کی شمالی ہند کی سب سے بڑی درسگاہ لکھنؤ کے سلطان المدارس میں داخل کر دیا۔ کیفی صاحب کے والد جہاں دنیاوی تعلیم کی اہمیت سمجھتے تھے وہیں انہیں خوف الٰہی بھی تھا۔ اس وقت کے مدارس کی تعلیم اور اس میں پڑھ کر نکلنے والے بچوں کی زندگی میں ہونے والی اصلاح سے وہ واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک حصول علم صرف لکھنا پڑھنا نہیں تھا بلکہ وہ یہ مانتے تھے کہ دین و دنیا کی تعلیم پسند کرنے والے راستے کی بھی کافی اہمیت ہے۔ اپنے تینوں بیٹوں کو انہوں نے دنیوی تعلیم کی جانب رواں دواں کیا تو کیفی صاحب کو صرف چودہ سال کی عمر میں سلطان المدارس میں داخل کیا۔ سلطان المدارس کی اس وقت کافی مقبولیت تھی۔ دور دراز ملک سے طلباء یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے۔ وہاں مولوی حضرات اپنے طریقے اور رعب سے بچوں کو تعلیم سے سرفراز کرتے۔ کیفی صاحب کے تجسس اور انقلابی طبیعت کے جوہر سلطان المدارس میں عیاں ہوئے بغیر رہ نہ سکے۔ سلطان المدارس، اس کے طریقے اور اس کے سلسلے میں خود کیفی صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

''میں دیکھتا ہوں کہ ہر روز جب انٹرول ہوتا ہے، مولانا جو ہمیں پڑھاتے تھے ہمارے درجے کے ایک لڑکے کو جس کے خط وخال دل کش تھے، اپنے ساتھ لیکر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور اندر سے دروازہ بند ہو جاتا، میں نیا نیا گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں تجسس زیادہ ہوتا ہے۔ میرے دل میں بھی کرید پیدا ہوئی کہ دیکھوں کمرے میں ہوتا کیا ہے۔ روشندان جو ذرا بلندی پر تھا۔ میں نے اس کے نیچے ایک اسٹول رکھا اور اس پر کھڑے ہو کر روشندان سے کمرے میں جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے مولوی صاحب پلنگ پر دراز ہیں۔ دو تین مولوی صاحب پلنگ پر، کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ لڑکا ہمارے مولوی صاحب کے پلنگ پر بیٹھا ایک چھوٹی سی کتاب پڑھ کر ان کو سنا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مولوی صاحب کہتے لاحول ولا قوۃ۔ اور لڑکے کے گال میں زور سے چٹکی لیتے۔ باری باری دوسرے مولوی صاحبان بھی یہی حرکت کرتے۔ اس وقت شیعہ مولوی صاحبان اور مولانا عبدا لشکور میں بڑے مناظرے ہو رہے تھے۔ میں سمجھا، اسی سلسلے کی یہ کوئی کتاب ہوگی۔ ہمارے مولوی صاحب جس کا منہ توڑ جواب لکھیں گے شاید۔

جب کمرہ کھلا اور لڑکا باہر نکلا تو میں نے اس کو پکڑ لیا، اور اس سے طرح

> طرح سے پوچھنا شروع کیا کہ تم کیا پڑھ کے سناتے ہو۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا اور مجھے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے بھاگ کر کمرے میں گیا اور کتاب لا کر مجھے دکھائی۔ یہ مختصر سے افسانوں کا مختصر سا مجموعہ انگارے تھا۔ جس پر یوپی سرکار نے پابندی لگا رکھی تھی۔ ترقی پسند ادب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا‘‘۔ [٦]

سلطان المدارس مولوی صاحبان کی ایک ایسی سلطنت تھی کہ وہاں کے عمل ردِعمل سے لے کر ہواؤں پر بھی انہیں کا قابو تھا۔ مدارس میں قاعدے قوانین پر سختی سے عمل کروایا جاتا۔ طلباء یا کسی فرد کی مجال نہ تھی جو ان قوانین میں دخل اندازی کرتا۔ مدارس کے ماحول میں ظلم اور من مانی کی بو آتی تھی۔ وہاں کے طریقۂ تعلیم مولوی حضرات کے مزاج اور طریقۂ شوق کا غلام تھے۔ طلباء اس ماحول میں خوف اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ مولوی حضرات کے ان احمقانہ رویے کو روکنے اور ان کو سبق سکھانے کی جرائت کسی میں نہیں تھی۔ سالوں سے چل رہے اس مدارس میں تعلیم کے نام پر طلباء کا استحصال ہو رہا تھا۔ سالوں سے خاموشی سے ظلم کو سہہ رہے طلباء کو یہ کہاں معلوم تھا کہ ان کے مدرسہ میں داخل ہونے والا سات سال کا بچہ جس کا نام اطہر حسین (کیفی اعظمی) ہے وہ ان کے تمام مسائل کا حل لائے گا۔ سلطان المدارس وہاں کے مولوی، وہاں کے قاعدے قوانین، طلباء کی حالت اور کیفی کے ردِعمل کو خود کیفی صاحب اپنی کتاب کیفیات میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

'' سلطان المدارس جس دن قائم ہوا تھا اسی دن اس کے سارے قاعدے قانون بن گئے تھے۔ اس میں حالات کے مطابق پھر کسی ترمیم و تنسیخ کو حرام سمجھا گیا تھا۔ میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر طالب علموں کی ایک انجمن بنائی اور انجمن کی طرف سے کچھ مطالبے مرتب کر کے سلطان المدارس کے ارباب حل وعقد کے سامنے پیش کیے۔ اس کا جواب ہم کو یہ ملا کہ یہ انجمن ہماری مخالفت میں بنائی گئی ہے۔ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے انجمن کو فوراً توڑ دو، انجمن بن چکی تھی۔ اس کو توڑنے کا کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ ہم نے کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کو نوٹس دیا کہ اگر فوراً ہماری انجمن کو تسلیم نہ کیا گیا تو ہم اسٹرائک کر دیں گے۔ اور ہوا یہی کہ ہم کو کچھ دنوں کے بعد اسٹرائک کرنا پڑی۔ اسٹرائک میں تمام طالب علم شریک ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد دفتر کا عملہ اور کچھ استاد بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ اسٹرائک کی اس وسعت سے ارباب اقتدار بوکھلا گئے۔ انہوں نے نوٹس دیا کہ سلطان المدارس بند کیا جاتا ہے اور بورڈنگ بھی بند کیا جاتا ہے۔ تم لوگ کمرے چھوڑ دو اور اپنے اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ جب سلطان المدارس کھلے گا تم لوگ بلا لیے جاؤ گے۔ ہم لوگوں نے اس نوٹس کا نوٹس نہیں لیا۔ کمروں میں ہی ڈٹے رہے اور اپنے مطالبات پر بھی ڈٹے رہے۔ ایک رات حسین آباد کے کارندے موٹے موٹے ڈنڈے لے کر آئے۔ انہوں نے ہمارا سارا سامان کمروں سے نکال کر

باہر پھینک دیا اور ہماری اچھی خاصی پٹائی بھی کی۔ ہم بھی اہنساوادی نہیں تھے۔ ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ اور بورڈنگ پر قبضہ کئے بیٹھے رہے۔ اس وقت تک میری شاعری شروع ہو چکی تھی۔ شاعری کی ابتدا ایک روایتی غزل سے ہوئی تھی لیکن اس اسٹرائک کے دوران غزل گوئی چھوٹ گئی اور میں احتجاجی شاعری کرنے لگا۔ قریب قریب روز ایک نظم کہہ لیتا اور لڑکوں کو سناتا اور ان میں جوش پیدا کرتا۔ پٹائی کے بعد دوسرے دن سلطان المدارس کے شمالی پھاٹک پر میٹنگ ہو رہی تھی۔ لڑکے کچھ زمین پر بیٹھے تھے، کچھ کھڑے تھے۔ میں ان کے درمیان کھڑا ایک نظم سنا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت وجیہ بزرگ تانگے پر بیٹھے ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں گھبرایا کہ یہ حضرات آ کر ابھی ہم کو سمجھانا شروع کریں گے کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو۔ اس سے ہمارا اتنا بڑا تعلیمی ادارہ بدنام ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ گھبراہٹ میں میں وہ نظم اور جوش سے پڑھنے لگا۔ قریب آ کے وہ بزرگ تانگے سے اتر پڑے اور میٹنگ میں شامل ہو گئے۔ نظم ختم ہوئی تو انہوں نے مجھ سے وہ نظم مانگی۔ میں نے دے دی۔ ایک سرسری نظر ڈال کر انہوں نے نظم جیب میں رکھ لی۔ اور مجھ سے کہا تم اور تم جس کو چاہو اپنے ساتھ لے لو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں نے گنواروں کی طرح پوچھ لیا کہ آپ ہیں کون بزرگ؟ انہوں نے فرمایا مجھے علی عباس حسینی کہتے ہیں۔ علی عباس حسینی اردو والوں میں پریم چند کے بعد

دوسرا بڑا نام تھا۔ میں سر جھکا کے ان کے پیچھے ہولیا۔ وہ گولہ گنج میں رہتے تھے۔ گھر پہنچ کر حسینی صاحب نے نوکر کو چائے بنانے کا حکم دیا اور اپنے شہزادے سے کہا جاؤ دیکھو احتشام صاحب یونیورسیٹی سے آگئے ہوں تو بلا لاؤ احتشام صاحب قریب ہی بارودخانے میں رہتے تھے، احتشام آئے تو ان کے ساتھ اعظم حسین بھی آگئے۔ جو روزنامہ سرفراز کے ایڈیٹر تھے۔ حسینی صاحب نے نہایت زوردار لفظوں میں ہماری وکالت کی اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنی وہی نظم سناؤں میں نے نظم سنائی نظم اعظم صاحب نے لے لی کہ وہ اس کو سرفراز میں شائع کرینگے اور ہماری حمایت میں اداریہ بھی لکھیں گے۔ احتشام صاحب مجھے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے سردار جعفری صاحب سے ملایا۔ یہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری تھے۔ صدر اعظم صاحب نے ہماری تائد میں زبر دست اداریہ لکھا۔ جعفری صاحب ہماری میٹنگوں میں آنے لگے۔ اب ہماری ایجی ٹیشن میں توانائی پیدا ہوگئی۔ حسین آباد وقف کے متولیوں نے ہماری مانگیں مان لیں اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہماری اسٹرائک ختم ہوئی۔ لیکن میں اور میرے چند ساتھی سلطان المدارس میں سے نکال دئے گئے۔ خود کیفی اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے عائشہ صدیقی (افسانہ نگار) کے اس جملہ کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ ’صاحب، وہ ماں باپ نے اس لیے سلطان المدارس

میں داخل کر دیا تھا کہ وہاں سے یہ نکل کر مولوی بن کر ان لوگوں پر فاتحہ پڑھیں گے۔ لیکن وہاں مذہب کا فاتحہ پڑھ کر نکل آئے۔'' ے

تعلیم انسان کی اہم ضرورت ہے۔ کیفی صاحب شعبۂ ادب میں قدم رکھ چکے تھے۔ نیز سلطان المدارس سے باہر ہو چکے تھے۔ اب دینوی تعلیم کا موقع ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عصری تعلیم کا دامن تھام لیا۔ اور پرائیویٹ امتحانات کامیاب کرتے ہوئے اردو، عربی اور فارسی کی اسناد حاصل کی۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱) دبیر ماہر (فارسی)
۲) دبیر کامل (فارسی) (لکھنو یونی ورسیٹی)
۳) عالم (عربی)
۴) اعلی قابل (اردو میں)
۵) منشی (فارسی) (الہ آباد یونی ورسیٹی)
۶) منشی کامل (فارسی)

کیفی صاحب ایک سادہ طبیعت شخصیت تھے۔ آپ کا لباس، بات چیت کا طریقہ اور حلیہ آپ کی سادگی کی ضمانت تھا۔ آپ کا رنگ گندمی تھا نیز بال لمبے اور گھنگھرالے تھے۔ آپ کے مزاج میں خلوص تھا۔ اور آنکھوں میں بلا کی کشش۔

انٹرنیٹ پر موجود ایک پروگرام میں آپ کو موسیقی کے ساتھ گاتے دیکھتے ہوئے آپ کی سادگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لباس میں ڈھیلا ڈھالا کرتہ اور بڑی مہری کا پائجامہ ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ آپ سپاہیانہ وضع کا کھدر کا کرتہ پہنتے تھے جو ان کے تیور میں موجود سپاہیانہ عنصر کو عیاں کرتا تھا۔ باتوں کے دوران انہیں مسکراتے کم، ہنستے ہوئے زیادہ پایا جاتا تھا۔ آپ کے مزاج میں خود اعتمادی، سادگی، سنجیدگی، خورد نوازی اور خوش خلقی کے بہترین جوہر دیکھے جا سکتے تھے۔ کیفی صاحب میں قوت برداشت درجہ کمال تک تھی۔ ان کے بائیں پیر کی ہڈی ۱۹۷۸ء میں ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہو گئی۔ اس حد درجہ تکلیف کے دوران بھی وہ ہنستے ہوئے لوگوں کو شعر سنا رہے تھے۔ ساڑھے چار مہینے کیفی صاحب کا پیر بندھا رہا لیکن اس پر بھی انہوں نے شکایت نہیں کی اور ہر وقت خدا کا شکر بجا لایا۔ انہیں غریبوں کا خاص خیال تھا۔ وہ اپنے گزرے حالات کو کبھی بھول نہ پائے۔ اپنے ساتھ بھلائی کرنے والے شخص کو انہوں نے تاحیات یاد رکھا۔ یہاں تک کہ نقصان پہنچانے والے فرد کو بھی مسکرا کر معاف کیا۔ رواداری اور مروت کا ایک واقعہ ان کی شریک حیات شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''ایک دن ہمارے گھر میں چوری ہوئی۔ تمام بیڈ کور، چادریں، کمبل چوری ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ چور کون ہے۔ ایک چور مالی ہمارے گھر

میں کسی کے توسط سے آ گیا تھا۔ جب ہمارے گھر میں مستقل چوریاں ہونے لگیں اور مجھے پتہ چلا کہ یہ سارا کام اسی مالی کا ہے تو میں نے اسے نکال باہر کیا، اور ایک دن جب ہم لوگ گھر سے باہر گئے ہوئے تھے، اور گھر کھلا ہوا تھا تو موقع دیکھ کر وہ مالی پھر آیا اور گھر کے تمام کمبل اور بیڈ کور اٹھا لے گیا۔ جب میں نے کیفی سے کہا کہ تم خدا کے لیے پولیس میں خبر کرو کہ ہمارے یہاں اس طرح چوری ہوئی ہے اور چور صرف وہی مالی ہے تو کہتے ہیں: دیکھو شوکت، بارش ہونے والی ہے، اس غریب کو بھی چادریں اور کمبل کی ضرورت ہوگی، اس کے بچے کہاں سوئیں گے۔ تم تو اور خرید سکتی ہو، لیکن وہ نہیں۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب کیا جواب دیتی۔‘‘[۸]

ساحر اور کیفی صاحب میں ایک مرتبہ کسی رومانی اور ذاتی قسم کی بات پر اختلاف ہو گیا۔ اس اختلاف کے پیش نظر انجمن کے ایک جلسہ میں شاعر نے کیفی کی شاعری کے نقائص ہی نقائص پر مبنی ایک مضمون پڑھا۔ کیفی کو اس نظم میں ایک گھٹیا درجہ کا شاعر بتایا گیا تھا۔ کیفی صاحب اس جلسہ میں ابتدا سے آخر تک موجود رہے۔ مگر اپنی طرفداری میں ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔

خدا نے ہر فرد کو بے شمار کمالات اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ کیفی کو بھی

قدرت نے شاعرانہ ذوق بخشا تھا۔ آپ کے گھر کے ماحول نے اس میں رونق بھر دی۔ کیفی کے والد سے لیکر تمام بھائی بہترین شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ آپ کے بڑے بھائی سید ظفر حسین جن کا تخلص مجروحؔ تھا، منجھلے بھائی یوسف حسین تخلص بیتابؔ اور چھوٹے بھائی شبیر حسین سے حد درجہ متاثر تھے۔ کیفی صاحب کے گھر میں بے شمار دیوان موجود تھے۔ جس سے اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ آپ نے بھی استفادہ اٹھایا۔ آپ کا پسندیدہ دیوان ''دیوان میر انیس'' تھا۔ آپ کی شاعری میں انیس کی شاعری کا اثر ضرور مل جاتا ہے۔ انیس کی شاعری کا رعب ان کے تحت الشعور میں قائم ہے۔ انیس کے کلام سے اپنے لگاؤ کا ذکر کیفی صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں:

''جب میں چھوٹا تھا تو میری بہن جو سب سے بڑی تھی، روزانہ مجھے میر انیس کے مرثیے سناتی اور پھر میری عادت بن گئی کہ جب تک میں انیس کے دیوان سے دو چار بند اپنی بہن سے سن نہ لیتا تب تک رات بھر مجھے نیند نہ آتی۔ میر انیس کا کلام سنتے سنتے مجھے ان کے دیوان کا کافی حصہ ازبر ہو گیا تھا اور چونکہ حافظہ قوی تھا اس لیے ازبر کرنے میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اور مجھے انیس اور کچھ دوسرے شعراء کے اشعار اتنی کثیر تعداد میں ازبر ہو گئے کہ ہمارے یہاں جو آئے دن بیت بازی ہوتی اسے میں انہی اشعار کی مدد سے جیت لیا کرتا تھا''۔ [9]

کیفی صاحب کا گھر ادب کی محفلوں کا ایک مرکز تھا۔ آپ کا بھائیوں کے شاعرانہ جوش اور والد سید فتح حسین رضوی کے ادب دوستی نے کیفی صاحب کو شاعری کا ایک خوشگوار ماحول عطا کیا۔ آپ کے گھر میں وقتاً فوقتاً شاعری اور قصیدہ خوانی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ آپ کے والد اور بھائیوں کی بدولت دور دراز سے شاعر حضرات اپنے کلام کے ساتھ تشریف لاتے۔ اس وقت کیفی کی عمر وہ تو نہ تھی کہ آپ ان محفلوں میں شریک ہونے کے لیے اپنا نام درج کرواتے، لیکن ذہن ان محفلوں سے پختگی سے تیار ہو رہا تھا۔ وہ تمام شاعروں کی تخلیقات کا توجہ اور غور سے سنتے۔ ان کے ذوق وشوق کو یہ محفلیں پروان چڑھا رہی تھی۔ ان محفلوں سے کیفی صاحب نے کافی استفادہ اٹھایا۔ یہ بات تب ثابت ہوئی جب انہوں نے چند اشعار بذات خود تشکیل دئے اور اپنے بھائی کہ جن سے آپ کافی اتفاق رکھتے تھے، شبیر حسین وفاؔ کو دکھایا۔ وفاؔ آپ کی اس تخلیق سے بیحد متاثر ہوئے اور انہیں اس روز منعقد ہونے والی محفل قصیدہ خوانی میں پڑھنے کے لیے کہا۔ کیفی صاحب کافی شرم محسوس کر رہے تھے۔ کیوں کہ اس محفلوں میں کافی مقبول شعراء اپنے کلام پیش کرتے تھے۔ لیکن کیفی کی ہمت کا اندازہ تب ہوا جب شام کی قصیدہ خوانی میں اپنے کلام پیش کرنے والے حضرات میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ کیفی صاحب نے محفل میں اپنا کلام خود اعتمادی اور جوش کے ساتھ پیش کیا۔ خوب

واہ واہ بھی ملی، لیکن لوگ اس تخلیق کو کیفی صاحب کی نہیں بلکہ کسی اور کی سمجھ رہے تھے۔ کیفی صاحب نے لوگوں کو بہت یقین دلایا لیکن لوگوں نے ان کی عمر کے مدنظر ان کے کلام کی طاقت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ کیفی صاحب اس واقعہ سے بہت غمگین ہوئے۔ کیفی صاحب کو ایک بار پھر امتحان سے گزرنا پڑا۔ بہرائچ میں جہاں ان کے والد تحصیلداری کے عہدے پر مامور تھے، ایک مرتبہ کیفی کے ساتھ یوں ہوا کہ کیفی واقعی اپنے کو شاعر کہتے ہیں اور لوگوں سے شاعر کہلوانا بھی چاہتے ہیں تو ان کا امتحان لے لیا جائے۔ کیفی صاحب تو ایک موقع کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔ شوقؔ بہرائچی کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ کسی شاعر کا کوئی مصرع پسند کر کے کیفی صاحب کو دیں۔ شوقؔ بہرائچی نے آرزوؔ لکھنوی کی غزل کا ایک شعر انہیں دے دیا۔ جو یوں ہے۔

اپنی خوشی کے ساتھ مرا غم نباہ دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے

یہ شعر کسی ایسے شاعر کہ جس نے نیا نیا شعری دامن تھاما ہو، کافی مشکل اور سنگلاخ تھا، لیکن کیفی صاحب نے بڑی ہمت دکھائی اور معینہ وقت کے اندر ہی مکمل غزل کہہ لی۔ اپنی کم عمری کے باوجود کیفی صاحب نے کیسے اچھے اشعار نکالے ہیں کہ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ غزل کے اشعار پیش خدمت ہیں:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر مے
ہے اسی کے نام پہ جس کے ابل پڑے
مدّت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
دل خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

غزل کہنے کے بعد کیفی صاحب کو اپنے ممتحن شوق بہرائچی اور اپنے والد محترم کی کافی واہ واہ اور شاباشی دستیاب ہوئی۔ اس غزل کو پیش کر کے کیفی صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ صلاحیت کے جوہر جب پھوٹتے ہیں تو عمر کی کوئی بندش اسے روک نہیں پاتی۔ کیفی کی اسی غزل کو وقت کے مشہور مغنیہ بیگم اختر نے اپنی منفرد آواز میں گا کر زندہ و جاوید کر دیا۔

مشاعرے سے متعلق ایک واقعہ خود کیفی صاحب اپنی تخلیق کیفیات میں یوں قلم طراز ہیں:

''ابا بہرائچ میں تھے۔ قزلباش اسٹیٹ کے مختار عام یا پتا نہیں کیا وہاں ایک مشاعرہ تھا۔ بھائی صاحبان لکھنو سے آئے تھے۔ بہرائچ، گونڈہ، نانپارہ اور قریب و دور کے بہت سے شعراء موجود تھے۔ مشاعرے کے صدر مانی جائسی صاحب تھے۔ ان کے شعر سننے کا ایک خاص طریقہ تھا کہ وہ شعر سننے کے لیے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور اپنا سر اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا لیتے اور جھوم جھوم کر شعر سنتے اور داد دیتے۔ اس وقت شعراء حسب مراتب بٹھائے جاتے۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر قیمتی قالین بچھا ہوتا اور گاؤ تکیہ لگا ہوا ہوتا۔ صدر اسی چوکی پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھتا۔ جس شاعر کی باری آتی وہ اسی چوکی پر آ کے ایک طرف نہایت ادب سے دوزانوں بیٹھ کر اپنی غزل جو طرح میں تھی سنانے لگا۔ طرح تھی مہربان ہوتا، رازداں ہوتا وغیرہ۔ میں نے ایک شعر پڑھا:

وہ سب سُن رہے ہیں داد شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصہِ غم بھی بیاں ہوتا

مانؔی صاحب کو نہ جانے شعر اتنا کیوں پسند آیا کہ انہوں نے خوش ہو کر پیٹھ ٹھونکنے لگے۔ پیٹھ ٹھونکنے کے لیے پیٹھ پر ایک ہاتھ مارا تو میں چوکی سے زمیں پر آ رہا۔ مانؔی صاحب کا منہ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے دیکھا

نہیں کہ کیا ہوا۔ جھوم جھوم کر داد دیتے رہے اور شعر مکرر مجھ سے پڑھواتے رہے اور میں زمین پر پڑا شعر دہراتا رہتا۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں جتنی داد ملی اس کی یاد سے اب تک مجھے کوفت ہوتی ہے۔ بزرگوں نے اس طرح میرا دل بڑھایا کہ واہ میاں، ماشا اللہ، آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ کسی نے کہا، زندہ رہو میاں، کس اعتماد سے غزل سنائی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھ رہا تھا اور کسی نہ کسی طرح ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے میرے کسی بھائی نے غزل لکھ کر دی ہے جو میں نے اپنے نام سے پڑھی ہے۔ خیر، ان بزرگوں کی خوش فہمی کی میں نے زیادہ پرواہ نہیں کی۔ لیکن جب ابا نے بھی کوئی اس طرح کی بات کی تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں رونے لگا۔ میرے بڑے بھائی شبیر حسین وفاؔ ابا بیٹوں میں جنہیں سب سے زیادہ چاہتے تھے انہوں نے ابا سے کہا، انہوں نے جو غزل پڑھی ہے وہ انہیں کی ہے۔ شک دور کرنے کے لئے کیوں نہ ان کا امتحان لے لیا جائے۔ اس وقت ابا کے منشی حضرت شوقؔ بہرائچی تھے۔ جو مزاحیہ شاعر تھے۔ انہوں نے اس تجویز کی تائد کی۔ مجھ سے پوچھا گیا، امتحان دینے کے لیے تیار ہو، میں خوشی سے اس کے لیے تیار ہو گیا۔'' [۱۰]

کیفی کی پہلی غزل کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ اتنی کم عمری میں اتنے بلند خیال کی اس غزل نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ کیفی مشاعروں میں جو کچھ کہتے ہیں وہ مانگے کا اجالا نہیں، وہ خود انہیں کا ہے۔ کیفی کو اب صرف ایک استاد کی ضرورت تھی۔ جو ان کے اس فن کو تراشے۔ کیفی لکھنو میں استاد کی تلاش میں غور فرماتے تھے۔ اس وقت لکھنو میں دو استادوں کی مقبولیت کافی تھی۔ حضرت آرزؔو لکھنوی اور مولانا صفؔی۔ کیفی نے اپنے استاد کی پسند صفؔی۔ صاحب پر روک دی اور ایک دن ہمت کر کے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ صفؔی۔ صاحب مولوی گنج میں رہتے تھے۔ کیفی کی فرمائش اور اطلاع پر انہوں نے انہیں یاد فرمایا۔ کیفی صفؔی۔ صاحب کے روبرو گئے۔ انہوں نے کیفی سے ان کی عمر دریافت کی۔ اشعار پڑھوائے۔ داد دیا۔ اور کیفی کی غزل کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنی عمر کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک بہترین مشورہ دیا کہ ان کی شاعری کی عمر پانسٹھ برس کی ہے۔ وہ ان کی شاعری میں کوئی خامی ہو تو اصلاح ضرور کر دیں گے، لیکن پانسٹھ برس کے سینے میں گیارہ برس کے سینے جتنی جدت نہیں دستیاب ہوگی۔ استاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوئی اس شاعر کو کہ جو واہ واہ سے گمراہ ہوئے بغیر لکھتا رہے۔ اسی سبق کو ساتھ لے کر کیفی صاحب نے اپنا ادبی سفر کیا جس نے بعد میں بلندیوں کو سر کیا۔

کیفی کی غزل ان کے انداز بیاں اور ان کا رسوخ ہر محفل میں جان ڈال دیتا۔ زنانہ کالج میں کیفی کی تصویریں خوب فروخت ہوتیں۔ لڑکیوں کے محبوب شاعر تھے جو کیفی۔

۱۹۴۷ء میں کیفی جس مشاعرے میں شریک ہونے حیدرآباد پہنچے، انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ مشاعرہ ان کی زندگی بدل دے گا۔ اس مشاعرے میں کیفی کی طرح سردار جعفری، محترمہ سلطانہ اور مجروح سلطانپوری بھی۔ اختر حسین جو حیدرآباد کے روزنامہ ''پیام'' کے ایڈیٹر تھے ان کے یہاں شریک ہوئے۔

اس مشاعرے کی مقبولیت اور کیفی سے لوگوں کی محبت نے ہال کو لوگوں کے ہجوم سے بھر دیا۔ کیفی کے اسٹیج کے سامنے جو دبلی پتلی اپنے بڑے بھائی خورشید علی خان اور بہنوئی اختر حسین کے ساتھ بیٹھی تھی وہ لڑکی شوکت کیفی تھیں۔

کیفی اس مشاعرے میں ایک نظم سنا رہے تھے جس کا عنوان ''تاج'' تھا۔ اس زمانے میں نظام سرکار کا راج تھا۔ یہ نظم نظام سرکار کے خلاف تھی۔ کسی میں اتنی جرائت نہیں تھی کہ اعلیٰ حضرت کے علاوہ کسی اور خطاب سے مخاطب کر سکے اور نوجوان کیفی اس نظم کو گرج گرج کر سنا رہے تھے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

ہاں یہی تاج ای تاج زر افشاں کی قسم
حلقۂ جبر ہے محکومیٔ انساں کی قسم
شر کا عنوان ہے ہیہ جنگ کی تمہید ہے یہ
چھو کے جب اس کو ہوا جھومتی بل کھاتی ہے
خود بخود آگ ہر اک سمت بھڑک جھاتی ہے
مرگ میخانہ ہے گور رونق میخانہ ہے
زہر :ہی زہر ہے جس میں یہ وہ میخانہ ہے
اس کا سایہ جو کوئی شکل بنا دیتا ہے
اٹھ کے چنگیز خدائی کو ہلا دیتا ہے
ست ہے بغض بقا زرد ہے روئے توحید
کہ اس آغوش میں خوابیدہ ہیں فرعون ویزید
اف! یہ تاریک چمن اف یہ بھانک تنویر
عکس ڈالے ہوئے ہے زار کا منحوس ضمیر
نسل مذہب کا یہ رہتا نہیں پابند کبھی
فرق پر جس کے چمک جائے ہلاکو ہے وہی
جھوٹ اس کی تن آہن پہ جو پڑ جاتی ہے
آگ اگلتی ہوئی شمشیر ابھر آتی ہے
اس کی رونق نے اجاڑے ہیں گلستاں لاکھوں

اس نے بستی میں بسائے ہیں بیاباں لاکھوں
کانیں چھانی ہیں پہاڑوں کے ورق موڑے ہیں
ایک ہیرے کے لیے لاکھ جگر توڑے ہیں
گھر تو گھر شمع مزاروں کی بھی بجھ جاتی ہے
جب کہیں ان کے نگینوں میں چمک آتی ہے
سیم و زر اس کتے لیے لاکھ اگلتی ہے زمیں
یہ وہ کشکول گدائی ہے جو بھرتا ہی نہیں
صدق کو کذب سکھاتی ہے حکومت اس کی
علم کو جہل بناتی ہے سیاست اس کی
یہ وہ جادو ہے جو ایمان پہ بھی چلتا ہے
حسب منشا اسی سانچے میں خدا ڈھلتا ہے
خون حق آ کے اسی جام میں بنتا ہے شراب
جانکنی رقص کا پا جاتی ہے رنگین خطاب
اس کا طرح جو کبھی غیض میں لہراتا ہے
زہر سقراط کے پیالے میں چھلک جاتا ہے
زندگی اٹھتی ہے روز اس کو مٹانے کے لئے
اور بڑھتا ہے کوئی ضرب لگانے کے لئے

(تاج)

اس نظم نے شوکت کے بھائی خورشید علی خان کو حیرت انگیز کر دیا۔ انہوں نے کیفی کی تعریف میں کہا کہ ''اتنی سی عمر میں یہ ہمت''۔

کیفی سے شوکت کیفی کی پہلی ملاقات کا واقعہ خود شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''مشاعرہ ختم ہوا۔ کیفی کو لڑکیوں نے گھیر لیا۔ آٹوگراف کے لیئے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کیفی کی اس وقت کی پوزیشن کسی ہیرو سے کم نہیں تھی۔ اور جب یہ دبلی پتلی لڑکی اپنی آٹوگراف بک لیکر اسکے پاس پہنچی تو کیفی نے شرارت ایک بہت ہی مہمل شعر اس پر لکھ دیا۔ اس لڑکی کی خودداری کو بہت ٹھیس پہنچی۔ اور جب گھر پہنچی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے شکایت کی'' آپ نے ہماری آٹوگراف بک پر اتنا بُرا شعر کیوں لکھا؟''

کیفی مسکرائے اور اسی لہجے میں بولے آپ نے سب سے پہلے ہم سے آٹوگراف کیوں نہیں لیا۔ (کیوں کہ شوکت نے سردار جعفری اور مجروح سے پہلے آٹوگراف لیا تھا)۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نظریں ٹکرائیں اور کیفی کی اس نظم کی کیفیت وجود میں آئی۔

دور نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ   ٹھیس لگتے ہی اڑا عشق اڑا عشق شرارہ بنکر
ڑ کے پہلے انہیں جھکتی ہوئی نظروں میں رکا   زم معصوم حسین مست اشارہ بن کر
پھر نگاہ سے عرق آلود جبیں پر جھلکا   پنکھڑی پھول گہر لعل ستارہ بن کر
ڈھل کے ماتھے سے اتر آیا گل عارض میں   رنگ رس شہد نہیں، ان سے بھی پیارا بنکر
گل عارض سے سمٹ آیا لب رنگیں میں   راگ ئے، لہر ہنسی، برق کا دھارا بن کر
لب گل رنگ سے پھر رینگ گیا باہوں   میں لوچ، خم، جذب مچلتا ہوا پارہ بنکر
بس کے بانہوں کی گدازی میں چلا دل کی   طرف چاہ الطاف کرم پیار مدارا بن کر

دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جان دل جان جگر جان نظارہ بن کر

پیکرے حسن سے پھر اُڑ کے چلا میری طرف   ایک بدمست جوانی کا اُتارا بن کر
رہزن ہوش مگر ہوش کا پیغم لیے   دشمن ضبط مگر ضبط کا یارا بن کر
درد ہی درد مگر وجہ سکوں، وجہ طرب   سوز ہی سوز مگر جان سے پیارہ بن کر
آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی پہ مری   مری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارہ بن کر

اب شرارہ وہی اس کے دل بیدار میں ہے
اور کیفی مرے تپتے ہوئے اشعار میں ہے

(شرارہ)

کیفی اب شوکت نامی خاتون کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ محبت کے اس قدم نے گھر میں ایک وسیع تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ گھر میں مخالفت کا

بازار گرم ہوگیا۔ جھگڑے رونا پیٹنا اور اپنے اپنے خیالات کا مظاہرہ ہونا شروع ہوگیا۔ پینتالیس روپے تنخواہ کے دور سے کیفی گزر رہے تھے۔ ماں کو فکر ستانے لگی کہ اتنی کمزور تنخواہ میں بیوی کا گزر کیسے ہوگا۔ بڑی بہن کو کیفی کے وقتاً فوقتاً جیل جانے کا حیلہ مل گیا کہ جس کا ایک پیر باہر اور ایک پیر جیل میں رہتا ہے وہ بیوی کو کہاں رکھے گا۔

شوکت کیفی اور کیفی اعظمی کی جیت اس وقت ہوئی جب ان کے والد نے یہ کہہ کر ان دونوں کو ممبئ بلوایا کہ 'زندگی اس کو گزارنی ہے' کیفی کو ایسے وقت میں حوصلہ دینے میں شوکت کیفی کے والد کا اہم رول رہا، اس وقت سجاد ظہیر اور رضیہ ممبئ میں مقیم پزیر تھے۔ انہوں نے اپنے گھر پر اس مستقبل کے نئے جوڑے کو مدعو کیا۔ اور تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں اس محبت کو نکاح کے دھاگے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باندھ دیا گیا۔

دورانِ نکاح عجیب مشکل پیش آئی، شوکت مذہب سے سُنّی تھیں اور کیفی شیعہ۔ اب دو قاضیوں کا بلانا ممکن نہ تھا۔ جب قاضی نے لڑکے یعنی کیفی کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا تو ''حنفی مذہب'' کے الفاظ قاضی صاحب کے سماعت سے ٹکرائے اور نکاح ہوگیا۔

شوکت اب شوکت کیفی اعظمی بن چکی تھیں۔ چاروں جانب سے مبارکباد کے نعرے بلند ہوئے۔ اور شاعری کا ایک معیاری مشاعرہ شروع ہو گیا۔ جس میں سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجد وغیرہ نے اپنے اپنے کلام بہترین نظموں اور غزلوں سے کیفی کی شادی کو یادگار بنادیا۔

یہ وہ وقت تھا جب کیفی کی نظموں کا نیا مجموعہ ''آخر شب'' زیر طباعت تھا۔ کیفی کی شادی کی معقول تحفہ کے طور پر سردار جعفری نے ایک کاپی بہترین اور خوبصورت میں طباعت کروا کر شوکت کیفی کو بطور تحفہ پیش کیا۔ اس کاپی کے اندر سردار جعفری نے شوکت کیفی کو ان کے گھریلو نام سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا ''موتی کے لیے''۔

زندگی جہد میں ہے جبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کو لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اوڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اور دوسرے صفحہ پر لکھا تھا ''ش'' کے نام۔

میں تنہا اپنے فن کو ''آخرِ شب'' تک لا چکا ہوں، تم آ جاؤ تو سحر ہو جائے۔ کیفی چنانچہ سحر ہوگئی اور ''ش'' شوکت بن کر ان کی زندگی میں آگئیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکی ہوں کہ کیفی کے حالات اس وقت اتنے خوش گوار نہ تھے۔ شادی کے بعد کیفی صاحب اور بیگم شوکت کیفی اندھیری کمیون کے کمرے میں زندگی گزارنے لگے۔ کمیون میں شامل لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ نہایت نیک اخلاق، انسان دوست اور روشن خیال و روشن دماغ تھے۔ یہ کمیون میں رہنے والے لوگوں کا نسب العین سماج کے کچلے اور پریشان لوگوں کے لئے ایک نئی دنیا بنانا تھا۔ جس میں وہ دن رات لگے رہتے۔ یہ تمام لوگ ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ تمام فرد کو ''کامریڈ'' کہہ کر بلایا جاتا۔ جس کے معنی تھے ''مکمل انسان''۔ ان کامریڈیوں کا دن المیونیم یا تام چینی کے پیالے میں چائے اور ایک ہاتھ میں اخبار لیکر شروع ہوتا تھا۔ تمام نہا دھوکر صبح دس بجے ہی دوپہر کا کھانہ کھالیتے۔ جن میں دال، روٹی، چاول اور ایک سبزی شامل ہوتی۔ کھا پی کر اور اپنے اپنے کھانے کے برتن دھو کر تمام پارٹی کے کاموں میں مصروف کار ہو جائے۔ جب کیفی اور شوکت کیفی کمیون میں شامل ہوئے تو شوکت کیفی نے ایک با اخلاق خاتون کی طرح باورچی خانہ کی ذمہ داری

سنبھالی اور ایسے ایسے لزیز پکوان کا مریڈ تناول فرمانے لگے کے شوکت کیفی کی تعریفوں کے نعرے بلند ہونے لگے۔ شوکت کیفی تمام کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ کیفی اپنے حالات کے تحت کمیون میں رہ رہے تھے۔ جہاں پر کھانے وغیرہ کے تیس روپے ادا کرنے پڑتے۔ کیفی کی کل آمدنی ہی پینتالس روپے تھی۔ جس میں سے کھانے کے تیس روپے نکال کر باقی ماندہ پندرہ روپے ریلوے کے پاس اور سگریٹ کی نذر ہو جاتے۔ وہ اپنی بیگم کو کوئی پیسہ دے نہیں پاتے تھے۔ کیوں کہ کمیون میں رہنے کو باوجود پارٹی کی تنخواہ کیفی کے علاوہ ان کی بیگم کو نہیں مل سکتی تھی۔ آخر خدا نے خود انطام کیا۔ کیفی نے ایک روز نامچہ اخبار ڈیلی نیوز پیپر Daily news paper میں پانچ روپے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنا شروع کی۔ حالات کو معقول بنانے کی فکر کیفی کو دن رات ترکیب میں لگائے رہتی۔ اپنے شوہر کے حالات شوکت کیفی پر گراں گزرنے لگے۔ حالات کے پیش نظر شوکت کیفی کو کام کرنے کی ترغیب دینے والا واقعہ خود شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

”ایک دن پی۔ سی۔ جوشی میرے کمرے میں آئے۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیار سے کہا ”بیٹھو، بیٹھو“ اور خود ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا ”آج کل کیا کرتی ہو؟“ میں نے کہا کچھ نہیں“ پھر مسکرا کر

بولے، ''تمہیں پتہ ہے کہ ایک اچھی بیوی بننے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''ایک اچھی بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کا ہاتھ بٹائے، نوکری کرے، اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے، اور پھر شوہر کے ساتھ پارٹی کا کام بھی کرے''۔ کافی دیر تک میرے بارے میں پوچھتے رہے۔ اور وہ جب اٹھ کر گئے تو میں نے اپنے اندر ایک عجیب وغریب طاقت محسوس کی اور میں نے فیصلہ کر لیا۔

اس زمانے میں کیفی نے مجھے ایک کتاب لا کر دی۔ ''انسان کا ارتقاء''۔ اسے پڑھ کر جو رہے سہے جالے میرے ذہن میں لگے رہ گئے تھے وہ سب چھٹ گئی۔

پھر میں نے اپنا ارادہ کیفی پر ظاہر کر دیا۔ کیفی چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مزدوروں میں کام کروں۔ لیکن میں نے ''انڈین پیوپلز تھیٹر'' کا اسٹیج اپنے لیے چن لیا اور آج تک اس میں کام کر رہی ہوں۔

میں کمانے کے لیے ریڈیو ڈرامے میں بھی حصہ لینے لگی۔ کبھی فلم کی ڈبنگ مل جاتی۔ پارٹی نے کیفی کی دقت کو محسوس کیا اور ''نیا ادب'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دو سو روپے ماہوار و تنخواہ مقرر ہوئی ۔'' [۱۲]

اگر ہم ''نظم'' مکان کی رونمائی کی بات کریں تو یہ ان دنوں کی بات ہے جب شوکت کیفی اور کیفی اعظمی پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنے کی غرض سے مدن پورہ کے مزدور علاقے میں جاتے۔ یہاں مقرر کے طور پر کبھی سردار جعفری تو کبھی سجاد ظہیر ہوتے۔ کیفی بھی ان مزدوروں سے مخاطب ہوتے۔ وہیں کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کیفی نے نظم ''مکان'' کہی جو اس طرح ہے:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھو، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کی خبر ہے نہ مکینوں کی خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ دیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیے اس لیے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورش تعمیر لیے

اپنی نس نس میں لیے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن نکلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
راک آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھو، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

(مکان)

حالات کبھی کیفی اور شوکت کیفی کے خوشگوار ہوتے تو کبھی پریشانیوں کی موج انہیں جدو جہد پر ڈال دیتی۔ شوکت کیفی اپنے شوہر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کہیں کوشش کرتیں تو کبھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش ہو جاتیں۔ مہینے میں ایک بار ایک روپیہ کرائے کی وکٹوریہ میں بیٹھ کر چاندنی رات میں کیمون آنا شوکت کیفی کو دنیا جہان کی خوشی دیتا۔ شوکت کیفی نے اپنے شوہر کا کسی بھی حالات میں ساتھ نہیں چھوڑا۔ خواہ وہ امور خانہ داری ہو یا جلوس اور میٹنگوں میں شریک ہو کر میلوں چلنا۔

کیفی کی ہر نظم اپنے ماحول اور معنی کے اعتبار سے اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کئی نظموں کے وجود میں آنے کو پیچھے ہندوستان کے حالات اور کیفی کا درد شامل ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی جب ۱۹۶۲ء میں تقسیم ہوئی تو کیفی کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ اور ان کی قلم سے جو نظم وجود میں آئی

وہ ''آوارہ سجدے'' کے عنوان پر مبنی ہوئی۔

اک یہی سوز نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سر مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
تم بھی محبوب مرے، تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی، چارہ گری
محرم درد جگر تم بھی نہیں ، تم بھی نہیں
اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جائے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں
دور منزل تھی ، مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لے کے پھری رہی رستے ہی میں وحشت مجھکو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آ جاتی
دار تک لے کے گیا شوق شہادت مجھ کو

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

(آوارہ سجدے)

کیفی اپنے گاؤں اور گاؤں کی زندگی سے کافی دور ہو چکے تھے کہ ۱۹۴۹ء میں اپنے بچے کی پیدائش کے سلسلے میں لکھنو اور پھر گاؤں جانا نصیب ہوا۔ کیفی اور شوکت کیفی تقریباً چار ماہ تک گاؤں مجواں میں رہے۔ جہاں پر رہنے پر کیفی سکون محسوس کر رہے تھے وہیں اپنی کیفیت کو شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''اتنے دن گاؤں میں رہنے سے گاؤں سے میرا دل بھر گیا۔ میں گاؤں میں رہنے کی بالکل عادی نہیں ہوں۔ میرا بچپن حیدر آباد شہر میں گزرا۔ البتہ کیفی اپنے گاؤں میں بہت خوش تھے۔ وہیں سے تلنگانہ تحریک پر ''تلنگانہ،، نظم لکھ کر پارٹی کو بھیجی۔ کئی نظمیں انہوں نے گاؤں میں بیٹھ کر لکھی۔ گرمی سخت پڑتی تھی۔ ہمارے اندر کے کمرے میں چھت پر لگا ہوا ایک پنکھا ہوتا تھا، کپڑے کا، میں اور بچہ سوتے رہتے اور یہ اپنی میز کے قریب اپنے پیر

سے پنکھے کی ڈوری باندھ لیتے اور اسے کھینچتے رہتے اور ہاتھ سے نظمیں لکھتے اور سوچتے رہتے۔ کسی نے گاؤں کے لڑکوں سے یہ بات کہہ دی۔ اب کیا تھا لڑکے ہاتھ سے پنکھا کھینچنے کی نقل اتارتے۔ اور کیفی کو چھیڑتے۔ (گاؤں میں بیوی کا کام کرنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا)

پھر میں کیفی کے پیچھے پڑ گئی کہ یہاں سے چلو۔ پیسہ ہمارے پاس ایک نہیں، ''چلیں تو کیسے'' کیفی کہتے۔ پھر ہم کیفی کی چھوٹی بہن بشریٰ سے دو سو روپے لے کر بمبئی آگئے۔''[۱۳]

کیفی اور شوکت کیفی جب بمبئی پہنچے تو ان پر ایک اور پہاڑ ٹوٹا۔ ان کا اندھیری میں موجود کمیون ٹوٹ چکا تھا۔ انہیں سنبھالنے والے اور کنبے جیسی شفقت دینے والے اراکین بھی بکھر چکے تھے۔ بیگم رضیہ لکھنؤ بھیج دی گئیں تو سجاد ظہیر پاکستان۔ شوکت کیفی اس وقت اپنے بچے کو لے کر حیدر آباد مقیم پزیر ہوئیں۔ کیفی کے سر سے اب کچھ دنوں کے لیے بیوی اور بچوں کی ذمہ داری دور ہو چکی تھی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ کانفرنس کی جگہ بمبئی کے بجائے بھیمنڈی پسند کی گئی کیوں کہ بمبئی میں اس کانفرنس کو کرنے پر پابندی عائد تھی۔

کیفی صاحب زندگی کی جد و جہد سے ممبئی میں گرفتار تھے کہ لکھنو سے آنے والے ایک تار نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ لکھنو میں بیوی بچے کو چھوڑ کر مطمئن کیفی کو کیا معلوم تھا کہ حالات اور سرمایہ کی تنگی کی ان کے بچے کو نگل لے گئی۔ کیفی صاحب کے بچے کو لکھنو میں ٹائفائڈ اور نمونیہ ہوا اور پندرہ دن کی علالت کے بعد وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا اور جاتے جاتے کیفی اور شوکت کیفی کی دنیا کو تاریک کر گیا۔ کیفی اپنی بیگم کو لکھنو سے ممبئی لے آئے اور سلطانہ بیگم کے گھر چھوڑ دیا۔ اور دوبارہ کانفرنس کو کامیاب بنانے کی جد و جہد میں لگ گئے۔ کیفی کی محنت رنگ لائی۔ اور کیفی اور مہندر ناتھ کی کوششوں سے کانفرنس کامیاب ہوئی۔ کیفی تو کانفرنس اور پارٹی کے کاموں میں اپنا غم بانٹ لیتے لیکن شوکت کیفی اپنے غم کو یوں بیان کرتی ہیں:

”ممبئی میں سلطانہ آپا کے گھر رہنے لگی۔ کیفی اور مہندر ناتھ کی انتھک کوششوں سے کانفرنس کامیاب ہوئی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا مینی فیسٹو وجود میں آیا۔ کانفرنس کی مصروفیات میں تھوڑے دن تو گزر گئے لیکن بچہ کے یاد مرے دل سے نہیں جاتی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی۔ اس کا ایک چھوٹا سا کرتہ اپنے پاس رکھتی۔ اسے آنکھوں پر رکھ لیتی بس اسٹاپ پر اگر کسی عورت کی گود میں ایک سال کا بچہ دیکھ لیتی تو اپنا بچہ یاد آجاتا اور پیروں میں اتنی سکت نہ رہتی کہ کھڑے رہ سکوں۔“ [۱۴]

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ کیفی صاحب نے گانے لکھنے کی ابتدا کب اور کیوں کی تو اس کے لیے شبانہ جو کیفی صاحب کی صاحبزادی ہیں اسکی ولادت اور کیفی صاحب کی معاشی فکر ذمہ دار ہے۔

کیفی پارٹی کے کام میں شامل تھے۔ چنانچہ حالات کے پیش نظر انہیں لوگوں کی نگاہوں سے چھپنا یعنی انڈر گراونڈ ہونا پڑتا۔ ایسے حالات میں شوکت کیفی کی ذمہ داری پارٹی پر آجاتی اور چونکہ شوکت کیفی تنہا تھیں تو کسی پر گراں نہ گزرا لیکن جیسے ہی کسی بچے کی موجودگی کی بو پارٹی تک پہنچی سخت مخالفت کی گئی کہ بچہ نہیں ہونا چاہئے۔ شوکت کیفی اپنے پہلے بچے کی وفات سے ابھرنے کے لیے ابھی دوسرے بچے کے آنے کی امید لگائے بیٹھی تھیں وہاں یہ مخالفت نے انہیں بھی مخالفت پر آمادہ کر دیا اور شوکت کیفی اپنی والدہ کے گھر چلی گئیں اور وہیں ’’شبانا‘‘ کی پیدائش ہوئی۔

کیفی رات دن اس کوشش میں لگے رہے کہ کس طرح پارتی اور سماج کے پچھڑے طبقے کو بیداری تک لے جایا جائے۔ ممبئی کے ناگپاڑہ نامی مضافاتی علاقہ میں پارٹی نے ریجنل کمیٹی قائم کی۔ کیفی سکریڑی کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ کیفی نے اپنے قول اور فعل کے ذریعے مزدوروں کو منظّم کرنے

کا کام شروع کیا اور مزدوروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے طوائفوں اور چکلوں کے لئے بہترین کام کیے۔ کئی مظلوم اور بے بس خواتین کی مدد کی۔ کیفی کو اپنے ان کاموں کی وجہ سے کئی بار شوکت کیفی سے دور رہنا پڑا، یعنی پوشیدہ۔ کیفی کے وقتاً فوقتاً انڈر گراؤنڈ ہونے کا ایک واقعہ شوکت کیفی یوں فرماتی ہیں:

> ''مجھے یاد ہے کہ جب کوئی کامریڈ چھپتے چھپاتے مجھے ان سے ملانے لے جاتا تو خوشی سے میرا دل دھڑکنے لگتا۔ کبھی کبھی مہینوں کے بعد ملنا ہوتا۔ ایک ماہ بعد اندھیری کے کسی گھر میں جب میں ان سے ملنے گئی تو میں نے انہیں پہچانا ہی نہیں۔ انہوں نے مونچھیں رکھ لی تھیں۔ میں نے دیکھتے کہا۔ ''ہائے توبہ یہ کیا شکل بنالی ہے، بالکل پولس کانسٹبل لگتے ہو''۔ کیفی ہنس کر کہنے لگے ''اسی لیے تو جیل جانے سے بچا ہوا ہوں۔'' [۱۵]

کیفی کو اپنی غربت اور مفلسی اور اپنے بچے کی پرورش کی فکر نے فلمی گانے لکھنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے شاہد لطیف کی فلم ''بزدل کے لیے'' ''روتے روتے گزر گئی رات رے'' اور ''کاہے اب رے بلم'' یوں دو فلمی گانے قلم طراز کیے۔ دونوں گانوں کا معاوضہ ایک ہزار روپے دیا۔

جب کیفی کی بیٹی شبانہ دو مہینے کی تھی اس وقت شوکت اور کیفی ڈم ڈمکر روڈ پر رہائش پذیر ہوئے۔ یہاں شوکت کی ملاقات زہرہ نامی خاتون جو پرتھوی تھیٹر میں اور اپٹا کے ڈراموں میں سرگرم عمل تھیں ملاقات ہوئی۔ شوکت کے کام کرنے کے ارادے کو شوکت نے ان پر طاہر کیا پھر کیا تھا۔ زہرہ آپا نے انہیں پرتھوی راج سے ملاقات کروائی جنہیں لوگ پاپا جی کہتے تھے۔ شوکت کیفی سو (۱۰۰) روپے ماہانہ کی تنخواہ پر کام کرنے لگیں۔ شبانہ شوکت کیفی کے ہمراہ رہتی جس پر تھیٹر کے کسی بھی فرد کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ آج شبانہ ایک کامیاب فلم اداکارہ ہیں۔ اس کی بنیاد میں شاید شوکت کیفی کی اس وقت کی جدو جہد میں شبانہ کو شامل رکھنا ذمہ دار ہے۔ شبانہ تقریباً تین سال کی عمر تک تھیٹر میں اپنی والدہ کے کام میں ان کے ساتھ رہیں۔

کیفی کی تمنا اور سلطانہ بیگم کی کوششوں سے شبانہ کو ایک بہترین اسکوم میں داخلہ مل گیا۔ سبانہ پڑھنے میں کافی ذہین اور ملنسار طبیعت کی بچی تھیں۔ شبانہ ہر سال اسکول میں اول درجہ پاتیں۔ شوکت کیفی کو اپنی بچی پر ناز تھا۔

کیفی نے فلمی گانوں کو نئی سمت دی اور ان کے تحریر کردہ گانے کافی مقبول ہوتے۔ مثلاً کاغذ کے پھول فلم کا گانا:

وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم

بیقرار دل اس طرح ملے
جسطرح کبھی ہم جدا نہ تھے
تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے
ایک راہ پر چل کے دو قدم
وقت نے کیا۔۔

جائیں گے کہاں، سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بنرہے ہیں دل خواد دم بہ دم
وقت نے کیا۔۔

(کاغذ کے پھول)

اسی طرح کیفی نے بے شمار فلمی گانوں سے سب کا دل جیت لیا۔ کیفی کے قلم کا کمال لوگوں پر ان کے دو کارناموں سے خود بخود ظاہر ہو گیا۔ ایک تو

‘‘گرم ہوا’’ فلم جس کی کہانی، ڈائلاگ اور اسکرین پلے خود کیفی نے ہی لکھے اور دوسرا چیتن صاحب کی فلم ‘‘ہیر رانجھا’’ جو پوری منظوم فلم ہے۔ فلم گرم ہوا کے لیے کیفی کو تین ایوارڈ ایک ساتھ ملے، کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کا اور کہانی کیلئے نیشنل ایوارڈ۔

کیفی کی زندگی میں شوکت کیفی ان سے ہر دور اور ہر وقت جڑی رہیں۔ کیفی کی بیماری سے متعلق ایک حادثہ شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

‘‘۹ فروری ۱۹۷۳ء کو فالج کا اس قدر زبردست حملہ ہوا کہ زندہ رہنے کی کوئی آس نہ رہ گئی تھی۔ (بلڈ پریشر ان کو اکثر رہتا تھا۔ ایک دن ان کو چکر آیا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے۔ پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ تھورے دن بعد اسی طرح بے ہوش ہوئے۔ ڈاکٹروں نے زیادہ تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ ایک رات بخار اور شدید درد کی شکایت ہوئی اور اسی دوران دھڑ سے ان کا ہاتھ بے جان ہو کر گر پڑا ان کو شبہ بھی نہیں تھا کہ یہ ان کا ہاتھ ہے۔ اسپتال میں کافی دن زیر علاج رہے مگر انہیں لیٹے رہنے کی وجہ سے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ مفلوج ہو چکے ہیں)۔ بارہ گھنٹے برین ہیمرتج میں رہ کر کوئی واپس نہیں لوٹ سکتا۔ اور کیفی لوٹ آئے میرے لیے، میرے بچے کے لیے۔ میں ان کی کافی شکرگزار ہوں اور ساتھ ہی خدا کی بھی جس نے مجھ پر رحم کیا۔’’[۱۶]

کیفی جتنے بھی دن اسپتال میں رہے شوکت کیفی ان کا سایہ بنی رہیں۔ یہاں بھی کیفی کو کہاں چین تھا۔ ہر روز نئے کمالات ظاہر کرنے سے کیفی باز نہ رہے۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ شوکت کیفی یون بیان فرماتی ہیں:

“ایک دن سلطانہ آپا کے گھر سے اسپتال پہنچیں جہاں کیفی بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ان کے دروازے پر Don't disturb کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بیوی بھی چار بجے سے پہلے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک طالب علم کیفی کے سرہانے بیٹھا اپنا دکھڑا سنا رہا ہے۔ اور کیفی نیم بے ہوشی میں اپنے سر کے درد کے باوجود بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ میں یہ دیکھتے ہی جھنجھلا گئی۔ “حد ہو گئی ڈاکٹر نے آپ کو بات کرنے سے منع کیا ہے اور آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں”۔ پھر میں نے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا “میاں تم ذرا باہر آؤ”۔ وہ کسمسانے لگا۔ “میں۔۔۔ میں کیفی صاحب کو اپنے حالات سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے پیار سے کہا “ذرا آپ باہر آ جایئے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے”۔ لڑکا اٹھ کر باہر آنے لگا تو کیفی نے اپنی نحیف” اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا: “موتی یہ اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ مت کہنا ہو سکے تو اس کی جو ضرورت ہے اسے پوری کر دینا۔ میں اچھا اچھا کہہ کر باہر نکل گئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ احمد آباد کا رہنے والا ہے۔ سوتیلی ماں سے گھبرا کر بھاگ

آیا ہے اور یہاں کام چاہتا ہے۔ اور کیفی سے کام مانگنے آیا ہے۔'' ےا

اسپتال میں رہتے ہوئے کیفی کا ایک اور کارنامہ تھا ''نظم دھماکہ'' کیفی کی یہ نظم کا تحریری کام شمع زیدی نے سرانجم دیا۔ کیفی اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہتے جاتے اور شمع تحریر کرتی جاتیں۔

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے　　افق پر برق سی لہرا رہی ہے
یہ قیامت ہر طرف منڈلا رہی ہے　　زمیں ہچکولے پیہم کھا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
مچلتی، جھومتی، ہلچل مچاتی　　تڑپتی، شور کرتی، دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اٹھاتی　　قیامت کو جگا کر لا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
فضا میں آتشیں پرچم اڑاتی　　زمیں پر آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی　　سنہری روشنی پھیلا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
فضا گل جنگ کا میداں بنی ہے　　ہوا بپھرا ہو طوفاں بنی ہے
زمیں گہوارۂ جناں بنی ہے　　فلک سے خاک سر ٹکرا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

آیا ہے اور یہاں کام چاہتا ہے۔ اور کیفی سے کام مانگنے آیا ہے۔''کا

اسپتال میں رہتے ہوئے کیفی کا ایک اور کارنامہ تھا ''نظم دھماکہ'' کیفی کی یہ نظم کا تحریری کام شمع زیدی نے سرانجم دیا۔ کیفی اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہتے جاتے اور شمع تحریر کرتی جاتیں۔

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے　　　افق پر برق سی لہرا رہی
ہی قیامت ہر طرف منڈلا رہی ہے　　　زمیں ہچکولے پیہم کھا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
مچلتی، جھومتی، ہلچل مچاتی　　　تڑپتی، شور کرتی، دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اٹھاتی　　　قیامت کو جگا کر لا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
فضا میں آتشیں پرچم اڑاتی　　　میں پر آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی　　　سنہری روشنی پھیلا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
فضا گل جنگ کا میداں بنی ہے　　　ہوا بپھرا ہو طوفاں بنی ہے
زمیں گہوارۂ جناں بنی ہے　　　فلک سے خاک سر ٹکرا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بڑھی آتی ہے تعمیری تباہی　　جھکی پڑتی ہے نور افزا سیاہی
جھکولے کھا رہا ہے قصر شاہی　　ہوا زنجیر در کھڑکا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بٹا رکھے ہیں پہرے بیکسی نے　　خزانوں کے پھٹے جاتے ہیں سینے
زمیں دہلی، ابھر آئے دفینے　　دفینوں کو ہوا ٹھکرا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

نشانات ستم پھرا رہے ہیں　　حکومت کے علم ٹھرا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرا رہے ہیں　　غلامی اب وطن سے جا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

(آندھی)

اسی طرح نظم ''زندگی''، جس کی ابتدا تو بریچ کینڈی ہاسپٹل میں ہوئی لیکن یہ نظم اپنے انجام تک روس میں پہنچی جہاں ۱۹۷۴ء میں علاج کے لیے کیفی کو لے جایا گیا۔

آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی، بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ سحر ماتھے پہ شبنم چھڑکے

اس سے پہلے کہ مری بیٹی کو وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ مرے بیٹے کا مضبوط بدن
تن مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ
میرے ہونٹو کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی
زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لیے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی ے اک سانس بھی یم راج کو اپنا نہ دیا
آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف

کچے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا ''میں''
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا
رو رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا
کاٹ کے رکھ دیے صندل کے پراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کیا اتنے کہ خون کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آئیں
اور کمر سے مرے سر تک آئیں
سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خون دینے لگے

میرے اعضا کی تھکن
بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح
”اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لایا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھ
کہ مچلتے شعلے کھینچ لیں جوش میں
سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے مجھے
ایسا کوئی راگ ملے“
اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکاں نے لی انگڑائی
اور کانوں میں کہیں دور سے آواز آئی
بدھم شرنم گچھامی

سنگھم شرنم گچھامی
سنگھم شرنم گچھامی
چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے دستر سے ڈھانپا ہے بدن
پونچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتی بندیا
سوتے بچے کو بنا پیار کیے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لیے
چاہتا تھا کہیں بھکشا ہی میں جیون مل جائے
جو کبھی بند نہ ہو دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھ کو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی ے یہ کہا
تیرے اک گال پہ جس پل کوئی تھپڑ مارے
دوسرا گال بھی آگے کر دے
تیری دنیا میں بہت ہنستا ہے
اس کے سینے میں اہنسا بھر دے
کہ یہ جینے کاس طریقہ بھی ہے انداز بھی ہے

تیری آواز بھی ہے، میری آواز بھی ہے
میں اٹھا جس کو اہنسا کو سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے
آرہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھ کو
کسی مینار سے نیچے آکر
اللہ کبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ پر جوش اذاں
موت سے دے گی اماں
پھر تو پہنچا میں جہاں
میں نے دوہرائی کچھ ایسے یہ اذاں
گونج اٹھا سرا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان
کل من علیھا فان
اک طارف ڈھل گیا خورشید جہاں تب کا سر

ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی شریانوں میں خوں جم سا گیا
ہو گیا زخمی دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا جلتا ہے
جو صدیوں سے چراغ
آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
یہ سمندر جو بڑی دیر سے طوفانی تھا
ایسا تڑپا کہ مرے کمرے کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور لہرا کے کہا
شیو نے یہ بھجوایا ہے لو پیو اور
آج شیو علم ہے، امرت ہے عمل
اب وہ آساں ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لیاے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے
اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لیے آئی تھی

اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کے لیے
رات کی لاش ملی پانی میں۔

(زندگی)

کیفی کی اب تک چار کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جھنکار، آخر شب، آوارہ سجدے اور فلمی گیتوں کا مجموعہ میری آواز سنو۔ آوارہ سجدے ان کا نیا انتخاب ہے۔ آخر شب کے بعد انہوں نے بہت ساری نظمیں لکھیں لیکن اسے اس مجموعۂ کلام میں شامل کرنے کے قابل نہیں سمجھا۔ اس مجموعے کو کافی انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ جیسے نہرو ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور یو۔ پی۔ اردو اکادمی ایوارڈ وغیرہ وغیرہ۔

کیفی کو صرف انسان سے ہی نہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں سے بھی حد درجہ محبت اور اپنائیت تھی۔ انہیں مختلف پودے لگانا پسند تھا۔ وہ دور دور سے پودے منگوا کر اسے لگاتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے باغیچہ میں پودے کے بیج لگانے میں مصروف تھے کہ ایک مرغی اور اس کے بچوں نے کرید کرید کر بیج نکال لیا۔ کیفی صاحب نے بے ارادہ سے ایک پتھر مرغیوں کی جانب انہیں بھگانے کے مقصد سے اچھال دیا جس کی وجہ سے مرغی کا ایک بچہ ہلاک ہو گیا۔ کیفی کی

بہت کوششوں کے باوجود وہ بچہ نہ بچ سکا۔ اس حادثے نے کیفی کو دکھی کر دیا۔ ایک معمولی سے مرغی کے بچے کے ہلاک ہونے پر جس شخص کو اس قدر دکھ ہو کہ وہ تحریری کام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے شخص کے دل میں انسان اور انسانیت کی فکر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

کیفی چاہے جتنے ہی بیمار رہتے علالت کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اپنے ایک ہاتھ کے مفلوج ہونے کے باوجود اسے اپنے راستہ کا پتھر نہ سمجھا۔ کیفی کی اسی قوت ارادی کو شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''ایک مرتبہ بہار کے ایک شہر گیا میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی۔ ان لوگوں نے کانفرنس انتہائی گرمی کے مہینے میں رکھ دی۔ کیفی نے فیصلہ کر لیا کہ میں جاؤں گا۔ میں بے حد ڈر گئی۔ اچھے اچھے رائٹرس گیا کی گرمی سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن کیفی کی ضد ان کو گیا لے گئی۔ وہاں سے وہ پٹنہ پیس کانفرنس میں بھی گئے۔ وہاں تو ہم دونوں مرتے مرتے بچے۔ اسٹیشن پر ایک لاکھ کسان واپس جا رہے تھے۔ اس میں میں اور کیفی پھنس گئے۔ اگر اس وقت ایک کسان اپنا ڈنڈا گھما کر ہماری مدد نہ کرتا تو لوگ ہم دونوں کو کچل کر آگے بڑھ جاتے۔'' [۱۸]

کیفی کی زیادہ تر نظمیں کسی نہ کسی حالات سے دوچار رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم ”لکھنو تو نہیں“ انہوں نے لکھنو کے ایک اسپتال میں بیماری کی حالت میں قلم بند کی۔

لکھنو کے اسپتال تک پہنچے کے لئے ان کی اپنے گاؤں اور پیڑ پودے سے محبت ذمہ دار ہے۔ گاؤں کی سڑک بنوانے کے سلسلے میں چیف منیسٹر یو۔ پی۔ رم نریش یادو سے ملنے گئے۔ کیفی سیڑھیا چڑھ رہے تھے کہ پیر پھسل گیا اور وہ گر پڑے۔ ان کے بائیں پیر کے چڑھے کی ہڈی کے ٹکڑے ہو گئے۔ کیفی کو لکھنو کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ران میں تین جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور پیٹ میں ہمریج ہو گیا ہے۔ آنتوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ دھیرے دھیرے افاقہ ہوا اور آپریشن کے بغیر ران کی ہڈی بھی جوڑ دی گئی۔ کیفی ساڑھے چار مہینے بید پر چت لیٹے رہے۔ اتنے غیر معمولی حالات اور جسم میں اتنی تکلیف کے باوجود کیفی ہمیشہ خوش رہتے اور ہر دن کے مکمل ہونے پر خدا کا شکر بجالاتے۔ یہاں پر تخلیق پائی نظم ”لکھنو تو نہیں“ قومی آواز میں چھپی۔

کیفی نے کبھی کسی پر بوجھ بننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی ضروریات کی اشیاء اپنی محنت سے حاصل کرتے۔ ان کی خودداری کا ایک واقعہ شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:۔

''اگر انہیں کچھ خریدنا ہوتا تو پہلے کوشش کرتے کہ کوئی کام مل جائے اور پیسے مل جائیں تو وہ کام کریں۔ کبھی کبھی شبانہ چڑھ کر کہتی ''ابا اگر یہی پیسے بابا (میرا بیٹا شبانہ سے چھوٹا ہے) کماتا تو آپ ہرگز اتنا پرہیز نہ کرتے۔'' تو ہنس کر جواب دیتے۔ ''نہیں بیٹے انسان کو اس وقت تک اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہیے جب تک اس کی طاقت ساتھ نہ دے۔'' [١٩]

اپنے گھریلو ماحول کو محسوس کرتے اور اس پر غور بھی کرتے جب صبح کیفی اپنی فیملی کے ساتھ لان میں بیٹھ کر چائے پیتے اس وقت وہ اپنی اہلیہ شوکت کیفی کے عمل پر نظر ثانی کرتے۔ ایسے ہی ماحول کو انہوں نے اپنی نظم ''ایک لمحہ'' میں یوں بیان کیا ہے۔

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں

جائے کی پیالی جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کے دل میں کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یوں ہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لیے
غم کی سوغات لیے
گرمیٔ جذبات لیے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں
برف پگھلنے ہی لگے

(ایک لمحہ)

انٹرنیٹ پر کیفی صاحب کے شعر پڑھنے کے طریقے کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ کیفی رواتی انداز میں ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیفی صاحب کے شعر پڑھنے کے طریقے کو علی سردار جعفری یوں بیان کرتے ہیں:

’’کیفی کے زوردار اور مہذب پڑھنے کے انداز نے ان کی شاعری کو ایک خاص معنی عطا کیے۔ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ بھی دوسرے شاعروں کے مانند مشاعروں میں روایت کی طرح اپنے شعر ترنم کےس ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ایک دفعہ جب انہوں نے اپنی ایک نظم مسز سروجنی نائڈو کو سنائی تو انہوں نے آخر میں مسکرا کر پوچھا کہ تمہیں اپنی آواز کا کچھ اندازہ ہے۔ تم نے کبھی سنا ہے؟ اور پھر انہوں نے کیفی سے اپنی شاعری تحت االفظ پڑھنے کے لیے کہا۔ جس پر کیفی راضی ہوگیے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے کیفی اور ان کی شاعری کی سیرت ہی بدل گئی۔‘‘ [۲۰]

حامد اللہ ندوی کیفی صاحب کے تحت الا لفظ پڑھنے کے انداز کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

’’کیفی اپنا کلام ہمیشہ اپنی اونچی اور بھاری آواز میں ایک مجاہد کی طرح پورے جوش وخروش کے ساتھ سنانے کے عادی تھے اور سناتے وقت اپنے اشعار کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اس خوبصورتیکے ساتھ ان کو مصور کر دیتے تھے کہی سامعین پر بھی ایک جوش کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔‘‘ [۲۱]

کیفی کو ہمیشہ اپنے لوگ اور قوم وملت کی فکر رہی۔ انہوں نے کبھی کسی بھی وقت کی شکایت نہیں کی۔ ان کے مضبوط جسم میں لوگوں کے لیے تڑپنے والا دل موجود تھا۔ وہ دوستوں سے وفادار تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اخلاق کے دامن کو پکڑ رکھا۔ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ خدا کا شکر بجالاتے رہے۔ بڑی سے بڑی بیماری میں بھی انہوں نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنے جسم پر بڑی سے بڑی آفت اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور اس کی مدد کرتے اور ہمیشہ دوسروں کو مدد کرنے کی تلقین کرتے۔ کیفی کو شعر وشاعری کے علاوہ کتابیں خریدنے اور پودے لگانے کا شوق تھا۔ وہ کئی دور دور سے پودے منگوا کر باغ میں لگاتے۔

کیفی کھانے کے معاملے میں سادگی پسند رہے۔ قیمتی اور لذیز غذا کی جانب ان کا لگاؤ کم تھا۔ دال چاول اور روٹی پر بھی وہ بے شکایت گزرا کر لیتے تھے۔ کیفی بہت زیادہ گفتگو پسند نہیں تھے۔ وہ مزید خاموش رہتے۔ کیفی سے متعلق عزیز قریشی فرماتے ہیں:

’’کیفی کم آمیز ہیں لیکن ان کے دوست بے شمار ہیں۔ کیفی کم گو ہیں لیکن ان کے اطراف ان کے سمجھنے اور ان کو چاہنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کیفی

تنہائی پسند ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے لے کر کمیونسٹ پارٹی اور پھر اپٹا کے ہر ہنگامے اور ہر سرگرمی میں کیفی صاحب سرگرم رہتے ہیں۔ کیفی کم ہنستے ہیں لیکن پتہ نہیں انہیں کیوں مل کر خوش وقتی کا احساس ہوتا ہے۔ کیفی کھلتے نہیں لیکن ان کے چاہنے والے برسوں سے ان کے چاہنے والے ہیں۔'' ۲۲

اس طرح کیفی اعظمی نے اپنی پوری حیات میں زندگی کے ہر حالات کا بڑی ہمت اور صبر سے سامنا کیا۔ انہوں نے کبھی بھی شکایت اور دہائی کا سہارا نہیں لیا۔ آج کیفی صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کے کارنامے قوم کے لوگوں کی جانب ان کی جدوجہد، عورتوں اور نوجوانوں میں بیداری کے کام اور ادب میں دیے گئے ان کے قیمتی عطیات کو عوام آج بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ کی وفات ۱۰ مئی، ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ اور ادب کی ایک ایسی شمع جس نے اپنی بے شمار نظموں، غزلوں، فلمی گیتوں اور بیداری کے پیغامات سے سماج کی آسلاح کی تھی وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ظاہری طور پر بجھ چکی تھی لیکن عوام اور قارئین کے دلوں میں آج بھی روشن ہے اور روشن رہے گی۔

حواشی:

۱ کیفی اعظمی: میں اور میری شاعری ص ۷
۲ ایضاً۔ ص ۱۹
۳ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۲۰

۴؎ عصری ادب: ۴۹، ۴۸ شوکت کیفی ص ۲۱

۵؎ کیفی اعظمی: فکر و فن ڈاکٹر شکیلہ رافت علی ص ۲۴، ۲۳

۶؎ کیفیات۔ کیفی اعظمی ص ۱۰

۷؎ ایضاً۔ ص ۱۳، ۱۲، ۱۱

۸؎ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ۵۷

۹؎ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۸۰

۱۰؎ کیفیات۔ کیفی اعظمی ص ۱۵، ۱۴

۱۱؎ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۴۲، ۴۱

۱۲؎ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ص ۴۵

۱۳؎ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ص ۴۸

۱۴؎ ایضاً۔ ص ۴۹

۱۵؎ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی، کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔ شاہد ماہلی ص ۶۴، ۶۳

۱۶؎ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ص ۵۳

۱۷؎ ایضاً۔ ص ۵۴

۱۸؎ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۶۱

۱۹؎ ایضاً۔ ص ۶۴

۲۰؎ کیفی اعظمی: علی سردار جعفری ص ۱۰۲، ۱۰۱

۲۱؎ کیفی صاحب: چند جھلکیاں حامد اللہ ندوی ص ۲۳۴

۲۲؎ کیفی صاحب: دو نیم مسکراہٹ کا نام، عزیز قیسی ص ۲۱۶، ۲۱۵

باب سوم

کیفی اعظمی کی غزل گوئی

صنف غزل اپنے اندر رومانی جذبات واحساسات کا بھرپور سرمایہ رکھتی ہے۔ اس کے مزاج محبت، عشق اور عشقیہ جذبات کا عنصر بے پایاں رہا ہے۔ ویسے یہ بات تو عام ہے کہ غزل کے لغوی معنی ہی عورتوں سے یا اپنی محبوبہ سے عشق ومحبت کی باتیں کرنا ہے۔ اگر اردو ادب کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو میں شعر موضوع کرنے والا تقریباً ہر شاعر پہلے غزلیہ شعر کی تخلیق کرتا ہے۔ اپنے اوپر بیتنے والے اور زمانے کے دوسرے لوگوں پر گزرنے والے حالات وتجربات کے وسیلے سے عشق کے گوناگوں واقعات پر نظر کرتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔

غزلیہ اشعار میں معشوق کی بیوفائیاں بے اعتنائیاں، بے رخی، رقیب و ناصح معاملات، میخانہ و پروانہ، دار ورسن، ملن وجدائی، ناز وانداز، گلشن وصحرا وغیرہ وغیرہ موضوعات مختلف پیرائے میں بیان کئے جاتے ہیں۔

فی زمانہ غزل کا کینواس کافی وسیع ہوگیا ہے۔ اس میں شعراء ہر قسم اور قبیل کا مضامین پیش کرنے لگے ہیں۔ زمانے کہ نئے نئے مسائل گوناگوں تجربات، مختلف النوع واوقات غزل کے حوالے سے شعر کے پیرائے میں بیان کئے جارہے ہیں۔ یہی نہیں حالات ومسائل کے بیان کے ساتھ ساتھ

اسکے مناسب و معقول حل اور علاج بھی غزل ہی کے حوالے سے واضح کئے جا رہے ہیں۔ غزل جیسا کہ زمانہ ماضی میں صرف عشقیہ مضامین یا معشوقانہ موضوعات کے لئے مختص سمجھی گئی تھی، فی زمانہ ایسا نہیں ہے۔

جہاں تک شاعر کیفی صاحب کی غزل گوئی کا تعلق ہے تو وہ فطرتا رومانی پسند واقع ہوتے ہیں۔ انکی طبیعت میں بچپن ہی سے رومانی جذبات موجزن تھے۔ ابتداء عمری ہی سے مزاج میں رومانیت غالب تھی۔ شروع ہی میں ان کے دل میں عشق نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔ اور وہ زلف گرہ گیر عارض و گیسو میں ایک فطری کشش محسوس کرنے لگے تھے۔ کیفی صاحب حسن کے مداح تھے اور حسن کی دیربانیوں اور قیامت خیزیوں سے ان کا محبت نواز دل بے پروہ نہ تھا۔ وہ فطری طور پر جمال پرست اور رومان پسند واقع ہوئے تھے۔ اپنے ایک مضمون۔ میں اور میری شاعری میں اپنے وہ اس فطری رجحان کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

"فصل کٹتی رہی میں نگرانی کرتا رہا، گاؤں کی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بھی فصل کاٹ رہی تھی۔ میں زیادہ تر اسی کے قریب کھڑا رہا۔ دوپہر تک اس کے گورے گورے گالوں سے دھوپ رنگ بن کر ٹپکنے لگا۔ اس کو کچھ اپنے

اوپر اعتماد تھا۔ کچھ وہ میری کمزوری بھی سمجھ چکی تھی۔ اسلئے میں نے اپنے پولیاں بہت بڑی بنا رکھی تھیں اور جب میں انکو دیکھنے لگتا تو وہ مسکرانے لگتی۔ اس نے پولیاں جیسی بنائی تھیں ایسی ہی میں نے اس کو لے جانے دیں۔ گاؤں کی ایک بوڑھی عورت یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑا سا اناج چرا رکھا تھا۔ اتنے میں چچا آگئے۔ انہوں نے اس بڑھیا کو پکڑ لیا۔ اس کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے ان سے نمک لگا کر میری شکایت جڑ دی کہ تو نے ہم سے مٹھی بھر جو چھین لئے تیرے بٹوا نے اوکا او جون پتریا کی طرح سنگار کرکے ری ری بوچھ کا بوجھ اٹھائے کے اوکے سر پر رکھ دیں چچا نے میرا کان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے اماں کے پاس لے گئے کہ ان کو بھی وہیں بھیج دیجئے۔ یہ گاؤں میں رہیں گے تو سب کچھ لٹا دیں گے۔ دو چار دن کے بعد اور اماں نے اموں کے ساتھ مجھے لکھنو بھیج دیا۔" [1]

کیفی صاحب ترقی پسند تحریک اور اسکے تقاضوں، ضروریات اور شرائط سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے اس سے کلّی طور پر وابستہ ہوگئے۔ انہوں نے اپنا تمام تر وقت، اپنی تمام فکری صلاحیتیں سماج کے پسماندہ پچھڑے طبقے نیز مزدوروں کی فلاح و بہبودی اور ان کے حقوق کی بحالی کے لئے صرف کر دیا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ترقی پسند نظریات وخیالات کو بڑی خوش اسلوبی

سے نظم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اور انہیں افکار و خیالات نے انکی شاعری میں گوناں گوں رنگ پیدا کئے۔ ان کی تمام تر شاعری کا مطالعہ سے پتہ چلتا ہے جبکہ انھوں نے غریبی، مفلسی فرقہ واریت، طبقاتی نظام، مذہبی جنوں اور تنگ نظری، مشترکہ قومیت، بھائی چارگی، رواداری، یک جہتی، اخوت جیسی قدروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، اور دم آخر تک فرقہ واریت کے خلاف جنگ و جہد کرتے رہے۔

اردو ادب میں غزل اپنی کلاسیکی رومانیت کے زیر اثر جن موضوعات کی حامل رہی ہے انکی گنجائش ترقی پسند تحریک کے علمبردار شعراء کے کلام میں مطلق دکھائی نہیں دیتی۔ تاہم قدیم غزل گو شعراء کی غزلوں کے موضوعات حسن و عشق کی واردات، ناز و انداز عیش و نشاط اور آرائش و زیبائش سے آگے نہیں بڑھتے۔ ہاں چند شعراء ایسے بھی ہیں جن کی غزلیں متصوفانہ اور عارفانہ موضوعات کی حامل ہیں۔

کیفی صاحب اپنی شاعری کی ابتداء میں اپنے گھر کی ادبی و شعری فضا سے بیحد متاثر ہوتے رہے تھے۔ ان کے بڑے چار چار بھائی شعر و شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ اور یہی نہیں چاروں بھائی صاحب دیوان شاعر تھے۔

ان کے والد بھی کہنہ مشق شاعر تھے۔ آئے دن گھر پر شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ ابتداء ہی سے گھر کا ماحول سے متاثر ہو کر کیفی غزل یا مرثیہ کہنے لگے تھے۔ پہلی غزل انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں لکھی تھی جس کا مطلع تھا

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل
پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل
پڑے

اس غزل کے دیگر اشعار بھی قابل داد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

جس طرح ہنس کر ہوئی پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسنے کو کلیجہ نکل پڑے
ایک تم کہ تم کو فکر نسیب فراز ہے
ایک ہم تو چل پڑے تو بہر حل چل بڑے
ساقی سبھی کو لے غم تشنہ بھی مگر
مئے ہے اس کے نام پہ جس کا ابر پڑے
مدت کا اور اس نے کی جو لطف کی نگاہ
میں خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

کیفی کے بیان کا مطلق یہ غزل انہیں بہت پسند نہیں آئی۔ لیکن لوگوں کے مشورہ دیا کہ اگر وہ شاعری کرنا چاہیں تو کسی قابل استاد سے باقاعدہ اصلاح لیا کریں۔ اس زمانہ میں لکھنؤ میں دو استاد شاعروں کا بڑا چرچہ تھا۔ ایک آزاد لکھنوی اور دوسرے مولانا صفی بہرائچی۔ کیفی صاحب نے صفی صاحب کا انتخاب بطور استاد کر گیا ایک دن ان سے بغرض اصلاح غزل رجوع کیا۔ مذکورہ غزل سنائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ان کے کلام میں زبان وبیان کی کوئی خامی نہیں ہے۔ انہوں نے مزید مشورہ دیا کہ ان کی اصلاح کے بعد کیفی کے کلام کی گرمی اور رنگینی ختم ہو سکتی ہے۔ کیوں کے استاد اور شاگرد کی عمر میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ واہ واہ کی پرواہ کیئے بغیر بس لکھتے رہیں۔ شعر کی خامیاں خشک پتوں کی طرح جھڑ جائینگی۔ اور خوبیاں نئی کونپلوں کی طرح پھوٹتی رہیں گی۔ کیفی صاحب نے استاد کا اس مشورہ پر عمل کیا اور آخر دم تک اس پر عمل پیرا رہے۔

کیفی صاحب ہنگامی واقعات وحالات سے انسانی زندگی تک نہ پہنچے بلکہ اس کا ہنگامی نوعیت پر ہی اکتفا کر لیا۔ اس سلسلے میں کیفی کی غزلیہ شاعری اور مجموعی طور پر انکی شاعرانہ خصوصیات کے ذیل میں خورشید نعمانی فرماتے ہیں:

" کیفی صاحب کی شاعری ہنگامی موضوعات کا آئینہ خانہ تو بن گئی لیکن فکر و فلسفہ سے عاری ہو گئی۔ کیفی کی شاعری میں کائناتی مسائل اور آفاقی عنصر کو تلاش کیا جائے تو اس کے نشانات مفقود نظر آئینگے۔ " ۲؎

مارکس کا نظریہ شاعری یہ تھا کہ اس نے اپنی تحریرو میں جمالیات کے انسانی اور سماجی کردار پر زور دیا۔ اس سے پہلے جرمن کلاسیکی ادب و فلسفہ میں بھی (کانٹ، ہیگل وغیرہ) کے یہاں بھی جمالیات کا مجرد تصور غالب تھا۔ اس میں سماجی پہلو شامل نہ تھا۔ کیفی جب کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہوئے تو مارکسزم سے قلبی و ذہنی طور پر متاثر ہوئے۔ لیکن انہوں نے شاعری میں رومانیت اور جمالیت کے ساتھ ساتھ انقلابی سماجی اور سیاسی پہلوؤں کو برتا اور اہمیت دی۔

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ شروع میں کیفی صاحب کی شاعری کا رنگ آہنگ رومانی تھا اور اس رنگ میں ان کے کلام میں کوئی اچھا اور خاطر خواہ نمونہ دستیاب نہیں ہوتا۔

ترقی پسند تحریک رومانیت کی اس موڑ پر سامنے آئی جب اس کا سب سے بڑا مسئلہ دردمند اور رومانوی مزاج کو سماجی آہنگ اور عصری شعور و تقاضوں

کے زیر اثر دینا تھا۔ لہٰذا رومان اور عصری وابستگی کا یہ خط فیض، مجاز، مخدوم سبھی کے یہاں سے گزرا ہے۔ کچھ شعراء نے دونوں کو الگ الگ حیثیت دی اور دونوں کو باہم سمونے کی کوشش کی۔ (مجاز کا مصرعہ "آہنگ نو" میں پاس ناموس نگاراں جہاں ہے تو اٹھو") بعض نے ہنگامی یا سماجی موضوعات میں تغزل کی رومانی کھنک پیدا کی۔ (مخدوم کی نظم انقلاب: گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے وغیرہ، کیفی صاحب کی خصوصیت شاعری اور خاص طور پر غزلیہ اشعار کی نوعیت کے بارے میں محمد حسن رقمطراز ہیں۔

" کیفی رومانویت اور تغزل سے آزاد رہ کر عصری مسائل کو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ (ایک معنی میں یہ آج بھی جاری ہے۔" [۳]

جس زمانے میں ملک میں ایمرجنسی نافذ کی گئی تو بہت سے شعراء جو سماجی وابستگی اور احتجاعی شعور سے منحرف ہو گئے یا پھر محدود ہو کر اپنی ذات میں سمٹ گئے۔ بہت سے کلاسیکی شاعری اور انسان دوستی کی طرف لوٹ گئے۔ اچھے اچھے اکثر شعراء قصیدہ پڑھتے اور لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ کیفی صاحب نے اس دور میں بھی اپنے سماج اور زمانے سے تعلق نہیں توڑا۔ انہوں

نے 'تیرے شہر میں' کی ردیف میں غزل، نظم "سناٹا" اور اخبار کی آزادئی اظہار پر پابندی لگنے پر ان کی نظم "آئینہ" اس زمانے کی یادگار نظمیں ہیں۔ کیفی یقین و اعتماد کا مدھم سار ہا بھی جلانے سے نہیں چوکتے۔

"ایک کروٹ اور بدلے گا ابھی ہندوستان"

کیفی کی شاعری کا ذکر ان کی غزل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ کیفی نے غزلیں کم کہیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں میں بھی علامتی انداز سماجی وابستگی کی بنیادوں پر ابھر کر اور نکل کر سامنے آیا ہے۔ جو لوگ اس تحریک کے نشیب و فراز سے واقف ہیں جس سے کیفی اور ان کے شاعری گہرے طور پر وابستہ رہی ہیں انہیں غزل کے اشعار میں نئی خصوصیت کا احساس ہوگا جو اردو غزل کا نیا شعری لہجہ بھی ہے۔ ایک غزل کے دو اشعار دیکھئے۔:

خار خش تو ہٹیں راستہ تو چلے
میں اگر اٹک گیا قافلہ تو چلے
بچلے لاؤ کھوڑ آئیں کہ تہیں
میں کہاں فش ہوں کچھ پتہ تو چلے

کیفی صاحب کی ابتدائی زمانے کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں رومانیت اور جمالیاتی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کیفی صاحب کی شاعری کی ابتداء قدیم مروج شعری ضابطوں اور روش کے تحت ہوئی۔ لیکن بعد میں انہوں نے اس طرز اظہار سے انحراف اور اجازت کی۔ ان کی جھنکار کی نظمیں اور غزلیں اور ایک شعبہ رومانی شعر کا ایک خوبصورت حصہ ہیں۔ ان کی اس زمانے کی نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

یہ چشم نازک یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو!
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
(تصور)

کلی کا روپ پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج کل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی
جبینِ تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
وہ چاندنی میں عکس لالہ زار لے کے آئی۔
(ملاقات)

کیفی صاحب کی خصوصاً غزلیہ اور رومانی شاعری جیسے ان کے شعری سفر کا پہلا دور کہا جاتا ہے "بڑی نرم و نازک سبک رفتار مترنم اور نغمگی سے بھرپور شاعری تھی۔ ان کے مصرعوں اور شعروں میں اتنی بے ساختگی، روانی اور رس ہے کہ پڑھنے والا ایک جادوئی کیف و سرور میں غرق ہو جاتا ہے۔ کیفی کی رومانی شاعری میں اثر پذیری ہے۔ اس کا سبب ان کی زبان کی سادگی کے جذبے کی سچائی ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت اس پر خیال آرائی کا شبہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی ہی واردات محسوس ہوتی ہے۔"

کیفی صاحب کی تمام تر کلام کے سرمایہ میں غزلوں کی تعداد بہ مشکل پانچ سات عدد پر ہی مختوف ہے۔ اور ان میں باقی اکثر غیر مردف غزلیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافیہ وردلف کی پابند نظموں میں مختلف مضامین کی شمولیت قدرے مشکل ہو سکتی ہے۔ جبکہ غیر مردف غزل میں کس حد تک آزادی اور آسانی ہوتی ہے۔ انکی غزلوں کی قلیل تعداد ان کے تیسرے مجموعے کلام " آوارہ سجدے " میں شامل ہیں۔ کیفی نے اپنی نظموں کا انتخاب بڑی سختی سے کیا ہے۔ اور یہی اصول انہوں نے اپنی غزلوں کے انتخاب میں رواں رکھا ہے۔ ان کی یہ مختصر غزلیں اس زمانے میں معرض تحریر میں آئی جب جان نثار اختر نے اپنی شعر گوئی کا رخ غزل کی طرف موڑ دیا تھا۔ غزلوں کے

ذریعہ وہ اپنی تخلیقی تعطل و جمود کو توڑنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

جاں نثار اختر سے پہلے خورشید احمد جامی نے بھی ایسی ہی مثال قائم کی۔ لیکن ان شعراء کے مقابلہ میں کیفی صاحب نے غزلوں میں اپنی نظم کی بنیادی آواز سے انحراف نہیں برتا۔ جو اختر کی نظموں اور بعد کی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ کیفی صاحب کے یہاں اس کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ کیفی صاحب کی غزلیں ان کے اپنے حقیقی و ذاتی تجربے سے ماخوذ ہیں۔ ان غزلوں میں بلا کا تیکھا پن بھی ہے، گہری نشتریت بھی ہے۔ مصرعے چست ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ کیفی کی اپنی شخصیت کی شفافیت ان غزلوں کی خصوصیت ہے۔ ان کی مختصر ہی سہی۔ لیکن انکی غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غزل انکی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا بہترین اور کامیاب وسیلہ اظہار ثابت ہو سکتی ہے۔ درج ذیل اشعار کے مطالعہ سے ان کی غزل گوئی کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

نئی زمین نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چھولے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

یہاں تو کوئی میرا ہم زباں نہیں ملتا
کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

غزل کی صنف جیسے اساتذہ سخن نے کاروبار عشق کیلئے وقف کر دیا تھا "آوارہ سجدے" میں آ کر فکر و احساس کے نئے گوشے اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان غزلوں میں کیفی کا کھرا شعری کردار بے رعایت، بے تکلفی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ لہٰذا ایسی غزل ملاحظہ فرمائیں۔

ہاتھ آ کر لگا گیا کوئی
میرا چھتر اُٹھا گیا کوئی
لگ گیا اک مشین میں میں بھی
شہر میں سے لے کر آ گیا کوئی
میں کھڑا تھا کے پیٹھ پر میری
اشتہار اک لگا گیا کوئی
یہ صدی دھوپ کو ترستی ہے
جیسے سورج کو کھا گیا کوئی
ایسی مہنگائی ہے کہ چہرہ بھی
بیچ کر اپنا کھا گیا کوئی
اب وہ ارمان ہے نی وہ سینے
سب کبوتر اُڑا گیا کوئی
وہ گئے جب سے ایسا لگتا ہے
چھوٹا موٹا خدا گیا کوئی
میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

(آوارہ سجدے)

مذکورہ بالا غزلوں کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں کے اشعار کو کیفی صاحب نے غزل کے مروجہ اور فرسودہ روایتی انداز و آہنگ سے الگ کرلیا ہے۔ ان کی غزلوں کی ایسی خصوصیت کے ذیل میں سید حامد حسین رقم طراز ہیں:

"انھوں نے اپنی غزل کو نہ تو احساس کے نہاں خانوں میں اسیر کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ تخیل کی طلسمی خیرگی سے اسے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ کیفی کی یہ غزلیں ایک پختہ تخلیق شعور کو ایک جامع ایمائی اظہار فراہم کرنے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔" [۴]

کیفی صاحب کی غزل گوئی کے تعلق سے ایک بات قابل غور ہے کہ جب ۱۹۶۲ء میں ترقی پسند کو فروغ و تقویت دینے والی کانفرنس ہوئی تو ہر طرف اسکی مخالفت میں نشستیں منعقد ہونے لگیں اور نئی نئی انجمنیں قائم کی جاتی رہی تھیں۔ بعض ترقی پسند یہ اظہار خیال کر رہے تھے کہ اردو شاعری کو سب سے زیادہ نقصان غزل نے پہنچایا ہے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ایک عرصہ تک ترقی پسند مصنفین نے غزل گوئی سے پرہیز کیا۔ حالؔی نے بہت پہلے ہی غزل گوئی کا مشورہ دے دیا تھا۔ غزل کی زبان پیرایہ بیان موضوع اور مضمون میں تبدیلی لائی گئی۔

فضا بہت جلد ہموار ہوئی ۔ فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی وغیرہ نے ترقی پسندی کی حمایت کی اور اسلاف کا احترام بھی ملحوظ رکھا۔

کیفی بنیادی طور پر تو نظم کے شاعر واقع ہوتے ہیں لیکن انہوں نے جب غزل کہی تو اس میں بھی ترقی پسندی کی نظمیہ روایت کو برقرار رکھا۔ انہوں نے مثبت ترقی پسندی پر ضرب بھی نہ آنے دی اور غزل کا وقار بھی باقی رکھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمود الٰہی تحریر فرماتے ہیں:

"عام طور پر غزل کے موضوعات میں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ میں اس وقت تسلسل کی عدم تسلسل کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا، لیکن کیفی صاحب نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی نظموں کے موضوعات کا جو مخرج ہے وہی غزلوں کا بھی ہے" [۵]

کیفی کی غزلوں کے چند منتخب اور بہت ہی مشہور اشعار کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

آج پھر ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھڑکیاں
آج پھر دیکھا گیا دیوانہ تیرے شہر میں
میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

کیفی نے اپنی چند نظموں کو غزل کا فارم میں ڈھالنے کی بھی کوشش کی اور وہ کافی حد تک اس تجربے میں کامیاب بھی ہوتے۔

جیسا کہ اس سے قبل یہ بات کہی جا چکی ہے کہ کیفی صاحب کا تعلق اردو کی ترقی پسند تحریک سے بڑا گہرا تھا اور وہ اسکے اہم رکن شمار کئے جاتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے بھی وہ سرگرم کل وقتی رضا کار تھے۔ اشترا کیت اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری گل ونغمہ و عارض وگیسو کی حکایت کا تزکرہ نہ رہ کر بلکہ ملک وسماج کے پریشان حال اور محروم انصاف لوگوں کے مسائل سلجھانے کی طرف مائل ہوگئی۔ انہوں نے اس طرح غزلیہ اشعار کہے کہ

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

کیفی صاحب کی غزلوں کی تعداد خوا کم ہی سہی لیکن انکی ایک واضح خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ارضیت پسندی کا حسن نمایاں ہے۔ مقامیت کی خوبصورت تصویر جلوہ گر ہیں۔ تمام غزلیں رومانی ماحول اور فضا سے معمور ہیں۔ ان غزلوں میں عام طور پر عشق ومحبت کے جذبات تو کارفرما نظر آتے ہیں لیکن ان کا آہنگ جداگانہ یا منفرد ہے۔ چند اشعار مزید ملاحظہ فرمائیں:

کیا جانے کس کی پیاس بجھانے کدھر گئیں
اس سر پہ جھوم کر جو گھٹائیں گزر گئیں
پیمانہ ٹوٹنے کا کوئی غم نہیں مجھے
غم ہے تو یہ کہ چاندنی راتیں بکھر گئیں
پایا تھا ان کو کھو بھی دیا چپ بھی ہو گئے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گزر گئیں
اب جس طرف سے چاہے گزر جائے کارواں
ویرانیاں تو سب میرے دل میں اتر گئیں

کیفی صاحب کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک سچے انسان اور سسکتی ہوئی انسانیت کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے انسانیت کے درد کو اپنی ذاتی زندگی میں جھیلا بھی ہے اور اس کو مٹانے کے لئے شب و روز کوشاں بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسین ان کی شخصیت اور شاعری کے پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

" کیفی اعظمی کی شاعری ایک ایسے حساس فرد کی شاعری ہے جو حکیمانہ شعور کو پورے طور پر اپنا کر مایوسیوں اور پھروں میں بھی زندگی کی آنکھو میں

آنکھیں ڈالنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہے۔ اور اپنی شخصیت اور شاعری کو انسان کے اس عظیم مجاہدے کا حصہ جانتا ہے جو ازل سے جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔" ٦

ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کے زیر اثر کیفی کے لئے غزل کا دامن بہت تنگ تھا۔ اس لئے اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کے لئے انہوں نے غزل کو خیر آباد کہکر نظم گوئی کا سہارا لیا۔ انکا ابتدائی دور کئی اعتبار سے کش مکش کا دور تھا۔ سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کافی حد تک تبدیلیوں سے گزر رہی تھی۔ اس دور میں جھنکار مجموعہ کلام شائع ہوا۔ اس دور کے انتشار، بحرانی کیفیت اور کش مکش اور غزل سرائی سے انحراف کا رجحان اس پر مجموعہ میں شامل پہلی ہی نظم سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ نظم کے اشعار دیکھئے:

طبیعت جبریہ تسکین سے گھبرا جاتی ہے
ہنسو کیسے ہنسی کم بخت تو مرجھائی جاتی ہے
بہت چمکا رہا ہوں خال و خط کو سعئ رنگیں سے
مگر پژمردگی سی خال و خط پر چھائی جاتی ہے
جوانی چھڑیتی ہے لاکھ خوابیدہ تمنا کو
محبت دل کے اضمحلال سے شرمائی جاتی ہے

کیفی صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں یعنی ۵۶ سال کی ادھیڑ عمر میں اپنے کلام کا ایک انتخاب بعنوان " آوارہ سجدے " مرتب کیا۔ وہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ: "اس مجموعہ میں صرف ان نظموں اور غزلوں کا انتخاب کیا ہے جو مجھے کسی وجہ سے پسند ہیں۔" ے

آوارہ سجدے سے ایک غزل کا رنگ وروپ اور لب ولہجہ دیکھئے: ۔

خاروخس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے
چاند سورج بزرگوں کے نقش قدم
خیر بجھنے دو ان کو ہوا تو چلے
حاکم شہر یہ بھی کوئی شہر ہے
مسجدیں بند ہیں میکدہ تو چلے
اس کو مذہب کہو یا سیاست کہو
خود کشی کا ہنر تم سکھا تو چلے
اتنی لاشیں میں کیسے اٹھا پاؤں گا
آپ اینٹوں کی حرمت بچا تو چلے
بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

یہ غزل کی ہیئت میں اپنے داخلی مشمولات اور نفسِ مضموں کے اعتبار سے نظم ہی کہی جاسکتی ہے۔ کیفی صاحب کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ غزل کا فارم میں بھی اپنے نظمیہ خیالات و نظریات کو خوش اسلوب اور موثر طریقے سے بیان کردیتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ کیفی صاحب کا پہلا مجموعہ کلام جھنکار شائع ہوا تو اس میں ان کے ابتدائی کلام شامل تھے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کیفی صاحب نے اپنے گھر کے شعری و ادبی ماحول کے زیر اثر اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ لیکن یہ امر حیرتناک ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام جھنکار میں ایک بھی غزل شامل نہیں کی۔ اس مجموعہ میں ۵۵ نظمیں شامل ہیں۔ دو ایک قطعا سے بھی ہیں۔

کیفی صاحب بنیادی طور پر رومان پسند واقع ہوتے ہیں۔ جمال پسندی ان کے ضمیر میں داخل تھی۔ لہٰذا ان کی ابتدائی غزلوں کے علاوہ نظموں اور پھر فلمی گیتوں میں بھی رومانیت اور جمال پسندی کسی نہ کسی رنگ و آھنگ میں جھلکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے رومان کو انقلاب و احتجاج کے پیرائے میں بیان کیا۔

باب چہارم

کیفی اعظمی کی نظم نگاری

کیفی اعظمی نے غزلیں بھی لکھیں اور گیت بھی لیکن ان کے مجموعی ادبی منظر نامے کے تفصیلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر تھے۔ کیونکہ نظم ہی وہ صنف سخن تھی جس کے ذریعے وہ اپنے ذہنی اور فکری رجحان کا اظہار موثر اور آزادانہ طور پر کر سکتے تھے۔

جہاں تک کیفی کی نظم نگاری کا تعلق ہے تو اس ضمن میں روس کے انقلاب کے ہمہ جہت اثرات ، ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں دن بہ دن بڑھتی ہوئی سرگرمیاں اور پھر ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں پی۔ سی۔ جوشی، سید سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، علی عباس حسینی، مجاز اور فیض وغیرہ سے ان کی ملاقات کا خاص دخل رہا ہے۔

ڈاکٹر وسیم انور کیفی کی ترقی پسند تحریک میں شمولیت اور ان کی نظم نگاری سے متعلق لکھتے ہیں۔

" احتشام حسین کیفی کو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر لے گئے اور وہاں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر علی سردار جعفری سے ملایا۔ ان

ملاقاتوں اور مباحثوں سے کیفی کا جنون سیاست اور شاعری دونوں بہت ترقی کرتے رہے اور پھر کیفی احتشام حسین کی فہمائش پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔"[1]

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا کہ روس میں انقلاب آنے کے بعد اس کے اثرات دنیا کے اکثر ممالک پر دیر اور دور تک پڑے۔ ہندوستان کی سیاست پر بھی اس عظیم انقلاب کا اثر ہوا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اپنے نظریات کی ترسیل اور اپنی سرگرمیوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے قومی جنگ نام سے ایک اخبار شائع کرتی تھی۔ کیفی اپنے ابتدائی زمانے میں اپنے ذہن اور طبیعت کے زیر اثر اس اخبار کو پابندی اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اس اخبار میں ہندوستان کے مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقے سے متعلق تفصیلات پڑھ کر کیفی بے حد متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے بھی انہیں موضوعات پر بلاعنوان نظمیں لکھ کر بھیجنا شروع کیا۔ جس سے کیفی کی غائبانہ شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں آزادی کی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں۔ کیفی اس حمایت سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ حالانکہ وہ اس وقت لکھنؤ کے معروف مدرسہ سلطان المدارس میں زیر تعلیم تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''میں پربھات پھیریوں میں شامل ہو گیا۔ منہ اندھیرے کسی پربھات پھیری میں شامل ہوتا اور نظمیں پڑھتا۔ ''اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے'' یہ ایک پربھات پھیری کے لیے میں نے کہی اور اس میں پڑھی تھی۔'' ۲

روس کے انقلاب سے متاثر ہو کر غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں جو نظمیں لکھتے تھے ان کا کوئی عنوان نہ ہوتا تھا۔ یہ نظمیں کیفی کمیونسٹ پارٹی کے آرگن قومی جنگ میں چھپنے کی غرض سے بھیجتے تھے۔ لیکن کیفی کی عنوان بغیر کی نظمیں پڑھ کر ترقی پسند تحریک کے ذمہ داران مثلاً سجاد ظہیر، علی سردار جعفری وغیرہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس کے بعد کیفی کی ملاقات علی عباس حسینی اور احتشام حسین سے ہوئی۔ کیفی صاحب ممبئی میں ترقی پسند تحریک کے کل وقتی ممبر بن گئے۔

کیفی کی شاعری کے مختلف رجحان کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کو مختلف تین دور میں تقسیم کرنا ہوگا۔

'' اس سلسلے میں مظفر حنفی نے ان کی شاعری کے ۱۹۴۵ سے ۱۹۶۲ کے دور کو مندرجہ ذیل تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔

(۱) ابتدا سے ۱۹۴۵ تک	دور اوّل
(۲) ۱۹۴۵ سے ۱۹۶۲ تک	دوسرا دور
(۳) ۱۹۶۲ سے تاحیات	تیسرا دور'' ۳

کیفی کی طبیعت رومان پسند اور جمال پرست تھی اس کا بیان وہ بذات خود کرتے ہیں کہ:

ہمارا سب سے بڑا کھیت جس میں گلے گلے جو آیا تھا وہ کٹ رہا تھا۔ اتفاق سے چچا کو تحصیل جانا تھا۔ وہ جاتے جاتے مجھے کھیت میں بٹھا گئے اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ دھیان رکھنا یہ لوگ بڑے بے ایمان ہوتے ہیں اور حرام خور بھی۔ یہ اکیسویں پولی ہمیشہ بہت بڑی بناتے ہیں۔ ایک ایک پولی میں دو دو تین تین پسیری اناج وہ لے کے چلے جاتے ہیں۔ کسی کو ایسا نہ کرنے دینا خبردار۔۔۔ میں نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ میں ایک بال کسی کو زیادہ نہ لے جانے دوں گا۔ مطمئن ہو کر چچا تحصیل چلے گئے۔ فصل کٹتی رہی میں نگرانی کرتا رہا۔ گاؤں کی ایک خوبصورت اور جوان لڑکی بھی فصل کاٹ رہی تھی۔ میں زیادہ تر اسی کے قریب کھڑا رہا۔ دوپہر تک اس کے گورے گورے گالوں سے دھوپ رنگ بن کر ٹپکنے لگی۔ اس کو کچھ اپنے اوپر اعتماد تھا کچھ میری کمزوری بھی وہ سمجھ چکی تھی۔ اس لیے اس نے پولیاں بہت بڑی بنا رکھی تھیں۔ اور جب میں ان کو دیکھنے لگا تو وہ مسکرانے لگی۔ اس نے پولیاں جیسی بنائی تھیں ویسی ہی میں نے اس کو لے جانے دیں۔ گاؤں کی ایک بوڑھی عورت یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑا سا اناج چرا رکھا تھا۔ اتنے میں

چچا آ گئے۔ انھوں نے اس بڑھیا کو پکڑ لیا۔ اس کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے ان سے نمک مرچ لگا کر میری شکایت جڑ دی کہ۔۔۔ توں اسے مٹھی پھر جو چھین لیے اور تہرے بنوائے اوکا، او جون پتریا کی طرح باان ڈارے آئی رہی تیرے بڑوانے اوکا او جون پتریا کی طرح سنگار کر کے کاٹے آئی رہی، بوجھ کا بوجھ اٹھائے کے او کے سر پر رکھ دیں۔ چچا نے میرا کان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گھر میں اماں کے پاس لے گئے۔ کہ اُن کو بھی وہیں بھیج دیجیے۔ یہ گاؤں میں رہیں گے تو سب کچھ لٹا دیں گے۔''۴

کیفی کی شاعری کے ابتدائی دور میں رومانیت کے عکس نظر آتے ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں عاشقانہ جذبات رومانی احساسات کی عکاسی صاف نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

ان کی ابتدائی غنائیہ نظمیں، نوجوانی کے عاشقانہ اور رومانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس دور کی نظموں میں جذبے کی صداقت اور گرمی پوری طرح موجود ہے۔ نوجوانی کے یہ جذبات ہر دور میں مشترک ہوتے ہیں اور ایک عالم گیر صداقت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کو صرف سطحی رومانیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''۵

کیفی کی رومانی نظمیں نہایت پر کیف اور عشقیہ جذبات سے لبریز ہیں۔ ان کی اہم رومانی یا عشقیہ نظموں میں برسات کی ایک رات، دوشیزہ مالن، شام، شباب، پیتل کے کنگن، سویرے سویرے، پہلا سلام، تجدید تبسم، دھواں، مشورے، حوصلہ، نرسوں کی محافظ، نقش ونگار، تم، ملاقات، تصور نغمگی، پشیمانی، مجبوری، نصیحت، اور احتیاط وغیرہ نظمیں ان کے دور اول کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ مثلاً ان نظموں کا حسن دیکھیے۔

یہ برسات، یہ موسمِ شادمانی
خس وخار پر پھٹ پڑی ہے جوانی
بھڑکتا ہے رہ رہ کے سوزِ محبت
جھما جھم برستا ہے پرشور پانی

فضا جھومتی ہے، گھٹا جھومتی ہے
درختوں کو ضو برق کی چومتی ہے
تھرکتے ہوئے اب کا جذب توبہ
کہ دامن اٹھائے زمیں گھومتی ہے

کڑکتی ہے بجلی چمکتی ہے بوندیں

لپکتا ہے کوندا، دمکتی ہیں بوندیں
رگ جاں پہ رہ رہ کے لگتی ہیں چوٹیں
چھما چھم خلا میں کھٹکتی ہیں بوندیں

فلک گا رہا ہے، زمیں گا رہی ہے
کلیجے میں ہر لے چبھی جا رہی ہے
مجھے پا کے اس مست شب میں اکیلا
یہ رنگیں گھٹا تیر برسا رہی ہے

فضا جھوم کر رنگ برسا رہی ہے
ہر اک شانس شعلہ بنی جا رہی ہے
کبھی اس طرح یاد آتی نہیں تھی
وہ جسطرح اس وقت یاد آ رہی ہے
(دوشزہ مالن)

کیفی اعظمی کی درج بالا پشیمانی، حوصلہ، سلام نظمیں ان کے رومانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ایک دلیل ہیں۔ کیفی کی نظمیں اپنی زبان اور منظر نگاری کے اعتبار سے بہترین مقام رکھتی ہیں۔ کیفی کی نظموں

کے سلسلے میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ان میں صرف عشقیہ جذبات ہی منعکس نہیں ہوئے ہیں، بلکہ مناظر فطرت کی بھی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ اس نوع کی تمام نظمیں کیفی کے مجموعہ کلام جھنکار اور آخر شب میں شامل ہیں۔ دور اول میں کیفی کے رومانی شاعری کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جس دور میں کیفی نے شاعری شروع کی اسمیں رومانیت کا غلبہ تھا اور کم وبیش تمام شعرا اسی رنگ کی شاعری کر رہے تھے۔ لہٰذا، یہ پورا دور رومانی شاعری ہی سے عبارت تھا۔ اقبال، اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے یہاں رومانیت کا پرتو بہت نمایاں تھا، یہی رومانیت آگے چل کر حقیقت میں تبدیل ہوئی۔ یہی وہ دور تھا جس نے کیفی صاحب کی شاعری کی رہنمائی کی۔ چنانچہ وہ بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور عشقیہ نظموں اور غزلوں سے اپنی شاعری کی ابتدا کی۔ کیفی کی اس نوع کی رومانی نظمیں نرمی، لطافت، نزاکت اور موسیقیت سے بھرپور ہیں، ان میں سادگی بھی ہے اور اثر آفرینی بھی، نغمگی بھی ہے اور آہنگ بھی۔ بطور نمونہ یہ نظم دیکھیے۔

ہائے! یہ پیتل کے کنگن اور تو جانِ بہار
وہ بھی لایا ہوں بہ مشکل وائے بر لیل و نہار
تو مگر ان کو پہن کر بھی بہت مسرور ہے

کیوں نہ ہو خاطر مرے اخلاص کی منظور ہے
جب سے میرے گھر میں تو آئی ہے اے مفلس نواز
بن گئی ہے ساری ہستی پیکر سوز و گداز
نوجواں دل میں سنانیں رنگ کی گڑنے لگیں
آہ ! قبل از وقت رخ پر جھریاں پڑنے لگیں
وہ گلابی انکھڑیاں ، وہ رس میں ڈوبے لب نہیں
میں نے جو گھونگھٹ میں دیکھے تھے وہ تیور اب نہیں
مطلع شادی پہ غربت کی اداسی چھا گئی
حیف وہ گھر جس میں آ کر خود شمع سنولا گئی
آسماں پر ہے ہوائے زر پرستی کا دماغ
سچ ہے کیونکر جس سکے گھر میں غلاموں کے چراغ
تو پھر کر ان کو خوش رہ چھوڑ جانے دے مجھے
جنگ کے ڈنکے پہ خونی گیت گانے دے مجھے

آگ برساؤں گا آنکھوں سے جدھر جاؤں گا میں
دیوزری کا مردہ پھونک کر آؤں گا میں

اس سلسلے میں مظفر حنفی کا یہ خیال اہم ہو جاتا ہے۔

‘‘کیفی اعظمی کے دور اول کی نظمیں رومانی تخلیقات ہیں۔ ان میں عنفوان شباب کے جذبات اور احساسات کرفرما ہیں اور جمالیاتی کیف ونشاط کے ساتھ ساتھ ندرت ادا بھی ان نظموں کا امتیازی وصف ہے۔’’[۶]

اسی ضمن میں یہ نظم بھی آجائے گی جس میں رومانیت کا عکس بہت صاف بھی ہے اور گہرا بھی۔ اس میں انقلاب کی آندھی کی آمد کا نہایت دلچسپ نقشہ کھینچا ہے۔

مچلتی، جھومتی، ہلچل مچاتی
تڑپتی شور کرتی دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اٹھاتی
قیامت کو جگا کر لا رہی ہے
اٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
(آندھی)

کیفی صاحب کی چند نمائندہ رومانی نظموں کے موضوعات اور ان کی جمالیاتی خصوصیات مختصراً روشنی ڈالی جائے۔ لہٰذا چند مشہور ومعروف رومانی نظموں کا تعارف مع حوالہ اشعار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مغنیہ عنوان کی نظم میں کسی مغنیہ کہ سحر انگیز نغمہ سرائی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شاعر کے ساتھ ساتھ خود خدائی بھی ہمہ تن گوش ہے۔ ہ نظم بلکل رومانی اور روایتی طرز کی ہے۔

کیفی کی رومانی نظموں کے حوالے سے ان کی ایک نمایاں خصوصیت پائی جاتی ہے کہ جب کبھی وہ کاروبار عشق میں اپنے آپ کو ناکام و نامراد محسوس کرتے ہیں تو احتجاج و بغاوت کرنے کے بجائے مایوس و نامراد ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی مایوسی اور ناامیدی بہت دیر تک قائم نہیں رہتی۔ اچانک ہی ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ جاگ اٹھتا ہے اور تابناک مستقبل کی یہ امید کی ایک تازہ کرن جاگ جاتی ہے۔ لہٰذا، وہ دوبارہ مسکراتے ہیں۔ ناامیدی امید میں بدل جاتی ہے۔ یہ کیفیت ان کی نظم تجدید میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس نظم کو ملاحظہ فرمائیں۔

تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
سب اس کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے
یقیں تھا اب نہ ہنسنا ہے نہ رونا
کچھ اتنا ہنس چکے تھے، رو چکے تھے

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر
نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں
تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
وہی چنگاریاں پھر مسکرا دیں

(تجدید)

کیفی صاحب کی یہ کیفیت ان کی اکثر نظموں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ جہاں وہ محبوبہ کی بیوفائی، بے رخی اور عدم توجہی سے دل شکستہ تو ہوتے ہیں لیکن فوراً ایک غیر محسوس قوت انہیں محبوبہ کی طرف راغب کرتی ہے۔ اور وہ دوبارہ اسے چاہنے کا جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ اور آزمائش کی بھی گزارش کرتے ہیں۔ یہ جذبہ نظم حوصلہ میں بہت قوی ہوا ہے۔

تو خورشید ہے بادلوں میں نہ چھپ
تو مہتاب ہے جگمگانا نہ چھوڑ

تو شوخی ہے شوخی رعائت نہ کر
تو بجلی ہے بجلی جلانا نہ چھوڑ

ابھی عشق نے ہار مانی نہیں
ابھی عشق کو آزمانا نہ چھوڑ

(حوصلہ)

اسی کے ساتھ کیفی صاحب کی نظموں میں خاموشی سے محبوبہ کے ظلم وستم سہنے کی روش پائی جاتی ہے بلکہ وہ محبوب کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔ نہ اسے کوستے ہیں نہ شکوہ گلہ کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم ''تبسم'' میں ان کی محبوبہ انہیں تڑپاتی اور جلاتی ہے۔ اور کیفی ہیں کہ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ وہ خاموش چپ چاپ ہونٹوں کو سی کر سب کچھ جھیلتے ہیں۔

اک کلی نوردیدۂ گلزار
گوہر شب چراغ باغ و بہار
نرم و نازک شگفتہ لالہ گوں
شوخ معصوم بے زباں طرار
مجھ پہ رنگینیاں لٹاتی تھی
لطف نظارگی مٹا ہی دیا
میں نے دست طلب بڑھا ہی دیا
پنکھڑی میں نہاں تھی چنگاری
ہاتھ جس نے مرا جل ہی دیا
اور کلی مجھ پہ مسکراتی تھی
(تبسم)

کیفی صاحب کی رومانی نظموں کا مزاج یہ بھی رہا ہے کہ وہ روایتی نظام

حیات کو بدلنے یا اس میں اصلاح کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ نئے زمانے کے نئ نسل پر بوڑھوں کی خواہ مخواہ کی پابندیوں اور بے جا جکڑ بندیوں کو وہ نافرمانی کیوجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بڑے بوڑھوں کو نئ نسل پرانے رسم رواج اور پرانے طور طریقے تھوپنا نہیں چاہئے۔ ہاں حدود اور شرائط کے اندر انہیں اپنے طور پر اپنی راہ خود بنانے کی آزادی دینی چاہئے۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں اور زمانے کے challenges کو اپنے طور پر قبول کرنے اور انہیں سلجھانے کا موقع فراہم کرنا چاہئے۔ اپنے اس خیال کو کیفی صاحب اپنی ایک نظم ''نرسوں کی محافظ'' میں نہایت موثر طریقے سے پیش کرنے ہیں۔

بٹھادئے تو ہیں پہرے قدم قدم پہ مگر
جھجک کے چلنے میں لغزش ضرور ہوتی ہے
گناہ ہوتے ہیں داخل وہیں سے فطرت میں
جوانی اپنا جہاں اعتبار کھوتی ہے

یہ تتلیاں جنہیں مٹھی میں پھینچ رکھا ہے
جو اڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ خاروں سے

تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ ان ناچتے شراروں سے
(نرسوں کی محافظ)

اسی ذیل میں کیفی صاحب کے نظموں میں محبوبہ کی وکالت کرتے ہوئے ایک مثبت جذبہ یہ بھی ملتا ہے کہ محبوبہ اپنے محبوب سے بے وفائی، بے اعتنائی اور بے رخی اختیار کرنے میں سماج کے رسم ورواج، زمانے اور مذہب کی بے جا پابندیوں کے سبب مجبور و بے کس ہوتی ہے۔ وہ بذات خود محبوب کی اس بے اعتنائی کا الزام نہیں دیتے بلکہ زمانے کا جبر اور رسم رواج کی سختیوں کو ذمہ دار ٹھراتے ہیں۔ اپنے اس عظیم خیال کو کیفی صاحب نے نظم ‘‘تصور’’ میں بڑے ہی دلپذیر انداز میں بیان کیا ہے۔ نظم کے بند اس طرح

نہیں محبت کی کوئی قیمت جو کوئی قیمت ادا کروگی
وفا کی فرصت نہ دے گی ہزار عزم وفا کروگی
مجھے بہلنے دو رنج و غم سے سہارے کب تک دیا کروگی
جنوں کو اتنا نہ گدگداؤ، پکڑ لوں دامن تو کیا کروگی
قریب بڑھتی ہی آرہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو (تصور)

کیفی صاحب کی ابتدائی شاعری میں وہ رومان پسند اور جمالیات کے شاعر نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریات سے ہم رشتہ ہونے کے بعد ان کی شاعری میں رومان کے ساتھ ساتھ ‘‘انقلاب، سیاست، احتجاج اور دیگر سماجی عوامل در آئے ہوں۔ نظم ‘‘ملاقات’’ میں کیفی نے خالص عشقی جذبات کو روایتی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کی نظم ‘‘پشیمانی’’ بھی خالص عشقیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نظم میں وہ عورت کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ عورت یا محبوبہ اپنے محبوب کی ناراضگی کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی اور اسے منا لینے کی طرف راغب ہوتی ہے اس فلسفہ کے تحت وہ تھوڑی دیر کے لیے دانستہ روٹھ جاتے ہیں کہ محبوبہ انہیں منا لے گی، جاتے ہوئے واپس بلائے گی۔ لیکن محبوبہ اپنی کسی مجبوری کے تحت ایسا نہیں کر پاتی اور بالآخر۔ نظم پشیمانی وجود میں آتی ہے۔ نظم کیا ہے اگر اسے ایک مختصر منظوم افسانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو
قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو

مگر اس نے روکا، نہ مجھ کو منایا
نہ دامن ہی پکڑا، نہ مجھ کو بٹھایا
نہ آواز ہی دی، نہ مجھ کو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہو گیا میں
(پشیمانی)

کیفی اعظمی کی رومانی نظموں کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی رومانی نظموں میں محبوب کبھی اپنی محبوبہ کے منفی برتاؤ سے بدظن یا بدگمان نہیں ہوتا۔ بلکہ معشوق کی عدم توجہی اور بظاہر بے اعتنائی کے لیے کوئی نہ کوئی سماجی معقول وجہ تصور کر لیتا ہے اور اس صورت میں محبوب بدرجہ مجبوری اپنے محبوب کو تمام سابقہ یادوں اور رشتوں کے شدید احساس کے ساتھ بھلاتی ہے۔ نظم ''اندیشے'' ایسی ہی کیفیت میں ڈوبی ہوئی نظم ہے۔ اس دو بند پر نظر کریں۔

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہو گا

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائیں ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیئے اور نہ بہائیں ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
اک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہو گا

(اندیشے)

اس قسم کی رومان میں ڈوبی ہوئی نظموں کے بارے میں انور سدید کی رائے ہے کہ: ''یہ شاعری ہندوستان کے ایک خاکی انسان کی شاعری ہے اس لیے اس میں مٹی کا جادو اپنا اثر و عمل خوبی اور خوبصورتی سے جگاتا اور شاعر کو افلاطونی بننے سے بچا لیتا ہے۔''ے

اس نظم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عاشق کے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ معشوق کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ یہی حسن کیفی صاحب کی دیگر نظموں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ جو ان کو دیگر ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''احتیاط'' میں بھی محبوب اپنی محبوبہ کو مشورہ دیتا ہے کہ:

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
تم کو یہ رسم بھی دنیا نہ نبھانے دے گی
بڑھ کے دامن سے لپٹ جائے گی یوں تازہ بہار
میری آغوش تصور میں بھی نہ آنے دے گی

(احتیاط)

ہندوستان میں حصول آزادی کے بعد زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سیاست، معشیت، تہذیب، سماج وغیرہ تمام شعبے کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے۔ شعروادب میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ نظریات بدلے۔ رجحانات بدلے۔ ایک قدر نے دم توڑا تو دوسری قدریں وجود میں آئیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں فسادات نفرت اور خونریزی کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جو کسی نہ کسی صورت میں تا حال جاری ہے۔ اسکے اثرات اردو ادب میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ خواہ کہانی ہو، افسانہ ہو، ڈرامہ یا ناول، نیز تمام منظوم اصناف ان اثرات سے مغلوب ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں پورے ملک میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک کی ادبی قدروں کو معدوم کرنے کی کوششیں تیز ہوئی اور ان کی معنویت تبدیل ہونے لگی۔ اس کے لب و لہجے اور موضوعات کے خلاف بھی ملک گیر سطح پر احتجاج کا دور شروع کیا گیا۔ جدیدیت کے رجحانات کو پروان چڑھانے کے لیے

تجربات کا ایک منظم سلسلہ شروع کیا گیا۔ فلمی دنیا سے وابستہ ترقی پسند شعراء مثلاً علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، مجاز لکھنوی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، وغیرہ کے ساتھ کیفی اعظمی کی شاعری کا رجحان اور رنگ وہی رہا کیوں کہ جدیدیت کا رجحان تنہائی کا رجحان تھا اس کا سر تھا نہ پیر۔ ترقی پسندی کی مخالفت ہی اس کا مقصد تھا۔ کیفی کی شاعری میں بھی دور اول کی رومانیت اور جمالیت کی جگہ سیاست، بغاوت اور رومان کے ملے جلے جذبات جگہ پانے لگے۔ یہ کیفی کے تخلیقی سفر کا تیسرا اور آخری دور تھا۔

۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آئے ہوئے مجموعہ کلام ''آوارہ سجدے'' میں شامل نظموں کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ چند نظموں کے متعدد بند ملاحظہ فرمائیں:

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوق چمن آرائی آج
اس سلیقے سے سجائی گئی بزم گیتی
تو بھی دیوار اجنتا سے اتر آئی آج

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں

پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

(ایک بوسہ)

''آوارہ سجدے'' نظم کا شمار کیفی صاحب کی اہم ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ نظم انہوں نے کمیونسٹ خیال کی بے ترتیبی کے بعد کہی۔ جب ان کے خواب چکنا چور ہوئے۔ ان کا اشتراکی نظریہ مجروح اور متاثر ہوا۔ کیفی کے نزدیک کمیونسٹ اکائی کا ٹوٹنا سوہان روح تھا جس نے ان کی شاعری کا رخ ہی بدل کرر کھ دیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کمیونسٹ اکائی ٹوٹ گئی۔ میرے سجدے آوارہ ہو گئے۔[۸]

اشتراکیت کی عدم یقینی اور بیزاری کے بعد وجود میں آنے والے نظم کے چند اشعار سے ہی یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ شاعر کا اشتراکی قدروں پر یقین و اعتماد کس درجہ مجروح و متاثر ہوا ہے۔

اب یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو، میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرمقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

اور

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکام ہوئے جاتے ہی
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

اور اختتامیہ میں محرومی کا اظہار کرتے ہوئے کیفی کہتے ہیں:

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہنما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا ہے
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

(آوارہ سجدے)

''آوارہ سجدے'' مجموعۂ کلام میں شامل نظموں کے مطالعہ سے کیفی صاحب کے اصل رنگ شاعری اور ان کی طبیعت کی سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ایک نظم کو پڑھتے جائیے ان کے لفظ لفظ اور ایک ایک مصرعے اور شعر سے کیفی کی سنجیدگی ٹھہراؤ، فطرت اور ایک فیصلہ کن نظریے کا انکشاف ہوتا چلا جاتا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں شامل چند نمایاں نظمیں مثلاً آخری رات، عادت، دائرہ، ابن مریم، بہروپنی، مکان، پیار کا جشن، گربھوتی، کھلونے، انتشار، ایک لمحہ، زندگی اور چراغاں وغیرہ میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

کیفی کی ویسے تو تمامی نظمیں اپنے اندر ایک وسیع مقام رکھتی ہیں لیکن ان کی ایک نظم 'مکان' کا مطالعہ کرنے سے ان کی اندرونی طاقت اور فکری قوت کا مشاہدہ ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ خوبصورت نظم اپنی معنوی خوبیوں اور لفظی بندشوں کے سبب اردو شاعری کی اہم نظم بن گئی ہے۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور ذرا، اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دئے اس لیے بجلی کے ستارے ہم نے

بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لیے

اپنی نس نس میں لیے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

(مکان)

درج بالا نظم نے کیفی کو اردو ادب میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام کی چند دوسری نظمیں ’آخر رات‘ اور ’ابن مریم‘ بھی پر لطف ہیں اور اپنی دلچسپی اور اپنے معنیاتی نظام کے سبب ایک نیا جہاں آباد کئے ہوئے ہیں۔

چاند ٹوٹا پگھل گئے تارے
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
پلکیں آنکھوں پہ جھکتی آتی ہیں
انکھڑیوں میں کھٹک رہی ہے رات
آج چھیڑو نہ کوئی افسانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

کوئی کہتا تھا ٹھیک کہتا تھا
سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا
دفن ہونے کو کیوں نہیں تیار
ہوش مندی ہے آج سو جانا
آج کی رات ہم کو سونے دو
(آخری رات)

تم خدا ہو
خدا کے بیٹے ہو
یا فقط امن کے پیمبر ہو

یا کسی کا حسیں تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو

مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یگوں سے آوارہ
تم یہاں سے ہٹو تو آج کی رات
سو رہوں میں اسی چبوترے پر

(ابن مریم)

اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد محسن لکھتے ہیں: ''کیفی اعظمی نے ابن مریم میں ہمہ جہتی تصویر بنائی ہے جس میں رمزیت کی ایک تہہ دوسری تہہ سے ملتی چلی جاتی ہے۔ بات تو صرف اتنی سی ہے کہ حضر عیسیٰ کا مجسمہ بمبئی میں ساحل سمندر کے قریب نسب ہے۔ اور رات کو ایک تھکا کاندہ بھوک سے نڈھال اور نیند سے چور نوجوان اس مجسمے کے شہ نشین پر سونا چاہتا ہے اور سوچتا ہے اگر یہ مجسمہ وہاں نہ ہوتا تو وہ آج کی رات آرام سے گزار لیتا۔ اور وہاں اس مجسمے کے ہونے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ یہاں چوروں اور اسمگلروں کی بستی میں ہر جگہ انصاف ہی انصاف ہے۔ حصہ بخرا انصاف سے بٹتا ہے اور

جو ایک دوسرے سے وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ اس مجسمے کی جگہ تو ویت نام کے جنگلوں میں تھی جہاں عیسیٰ کے نام لیوا خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ ''[9]

کیفی نے اس نظم میں جس قوت بیان اور تہ در تہ رمزیت سے کام لیا ہے اس نے اسے نئی قوت بخش دی ہے۔ کیفی کی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں صراحت اور غیر ضروری تفصیل نے جگہ نہیں پائی ہے۔

کیفی نے اپنی نظموں میں سماج کے ہر شعبے کو سمو لینے کی ہر ممکن اور کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے سیاسی رہنماؤں اور ان کے جھوٹے ارادوں اور وعدوں کو ان کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عوام میں بیداری لانے اور ایسے نیتاؤں اور حکمرانوں کے ارادوں اور ان کے کارناموں کے خلاف آمادۂ پیکار ہونے کا پیغام بھی سنایا ہے۔

ذیل کی نظم کے مطالعہ سے ان کے انہی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ریت کی ناؤ ، جھاگ کے مانجھی
کاٹھ کی ریل، سیپ کے ہاتھی

ہلکی بھاری پلاسٹک کی خلیں
موم کے چاک جو رکیں نہ چلیں

راکھ کے کھیت دھول کے کھلیان
بھاپ کے پیرہن دھویں کے مکان

نہر جادو کی ،پل دعاؤں کے
جھنجھنے چند یوجناؤں کے

سوت کے چیلے، مونج کے استاد
تیشے دفتی کے، کانچ کے فرہاد

عالم آٹے کے، اور روے کے امام
اور پانی کے شاعران کرام

اون کی تیر، روئی کی شمشیر
صدر مٹی کا اور ربر کے وزیر

اپنے سارے کھلونے ساتھ لیے
دست خالی میں کائنات لیے

دو ستونوں پہ باندھ کے رسی
ہم خدا جانے کب سے چلتے ہیں
نہ تو گرے ہیں نہ سنبھلتے ہیں

(کھلونے)

کیفی صاحب نے ملک کے افراتفری کے ماحول میں عوام کی فکر کو منضبط کرنے کے لیے کئی نظمیں قلم بند کی ہیں۔ ان نظموں میں انہوں نے ملک کی عوام کو ہر حال میں امید و حوصلہ کی تلقین کی ہے۔ انہوں نے ملک کی بدحالی پر افسوس ظاہر تو کیا ہی ہے، امید کے چراغوں سے اپنی زندگی کو روشنی کا احساس بھی جگایا ہے۔ یہ جذبہ ان کی نظم چراغاں میں بہت نمایاں ہے۔

ایک دو بھی نہیں، چھبیس دیے
ایک اک کر کے جلائے میں نے

اک دیا نام کا آزادی کے
اس نے جلتے ہوئے ہونٹوں سے کہا
چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے

اک دیا نام کا خوشحالی کے
اس کے جلتے ہی یہ معلوم ہوا
کتنی بد حالی ہے.
پیٹ خالی ہے مرا، جیب مری خالی ہے

ایک دیا نام کا یک جہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہنچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں ہیں جتنے پیوند
سب کو اک ساتھ اڈھڑتے دیکھا
دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دئے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکہ نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

(چراغاں)

کیفی کی شخصیت کے منفرد پہلو ان کی منفرد نظموں سے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے کسی ایک موقع یا شعبہ حیات پر نہیں بلکہ ذاتی اور سماجی حالات کے پیش نظر بہترین بامعنی نظمیں لکھیں۔ مثلاً:

ذرا پکار دو بے چین نوجوانوں کو
ذرا جھنجھوڑ دو کچلے ہوئے کسانوں کو

ادھر سے قافلۂ انقلاب گزرے گا
بچھا دو سینۂ گیتی پہ آسمانوں کو

(تلنگانہ)

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند اور بلند، اور بلند
بام و در اور زرا اور سنوارے ہم نے

(مکان)

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آ جاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انہیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر لیے

روز دھرتی میں سما جاتی ہے
زلزلوں میں تھی زرا سی گرمی
وہ بھی اب روز ہی آ جاتے ہیں

(دائرہ)

اس نے مجھ کو الگ بلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف کی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اگتے ہیں فرقے پلتے ہیں
خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشن آدم مٹا نہیں سکتا

(بہروپنی)

کیفی کی شاعری خصوصاً نظموں کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان میں تصور کی جلوہ گری، حقیقتنگاری، حسن و رنگ کے حسین امتزاج کے علاوہ تسلسل، ربط، احساس اور پوشیدہ جذباست کی کیفیات بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی

شاعری میں فکر کی گہرائی کا عنصر اس درجہ کثرت سے در آیا ہے کہ ان کو نفسیات انسانی کا شاعر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی کم و بیش تمام نظمیں انہیں جذبات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔ خصوصاً اندیشے، تصور، نرسوں کی محافظ، احتیاط اور منظر خلوت کے عنوان سے کہی گئی نظموں میں دلی واردت اور نفسیاتی پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کیفی کی مذکورہ خصوصیات سے متعلق لکھتے ہیں:

‘‘پشیمانی، ترنک کال، پامسٹ، حوصلہ اور تبسم اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ جن میں آج بھی تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔’’ [۱۰]

اس بات کے اختتام پر میں ضروری سمجھتی ہوں کہ کیفی کی نظمیہ شاعری سے متعلق ناقدین اور معاصرین کی رائے پیش کر دی جائیں تا کہ ان کی شاعرانہ خصوصیات مزید ٹھوس اور مثبت طریقے سے سامنے آ جائیں اور کیفی صاحب کی شعری جہات کا اندازہ ہو سکے۔

‘‘کیفی اعظمی ایک مقبول ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی ابتدائے عمر میں رومانیت میں ڈوبی ہوئی نظمیں لکھیں پھر شعوری طور پر قوم پرستی

اور آزادی کے گیت گانے لگے۔ اب کمیونسٹ نظریات میں اعتماد رکھتے ہیں۔

اور اپنی نظموں میں فنکارانہ طریقے سے انقلابی نظریت پیش کرتے ہیں۔

انہوں نے ملک اور غیر ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات پر بھی دلچسپ اور پر اثر نظمیں لکھی ہیں۔ عوام کے ساتھ دکھ کو انہوں نے اپنی نظموں میں اس طرح سمو دیا ہے کہ فن اور موضوع ایک ہو جاتے ہیں۔ ’’[۱۱]

‘‘یہ کہنا شاید کچھ لوگوں کے لیے تعجب خیز ہوگا کہ کیفی اعظمی ترقی پسندی کی وجہ سے شہرت یافتہ ہونے کے باوجود ترقی پسندانہ نظموں سے اردو نظم میں زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کا نام البتہ چند رومانی نظموں کی بنا پر زندہ رہ سکتا ہے جو انہوں نے شاعری کے ابتدائی دور میں اختر شیرانی کی رومانیت کے زیر اثر لکھی ہیں۔ [۱۲]

‘‘کیفی اعظمی کی ایک کمزوری یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سارے شعری talents کو کمیونسٹ پارٹی اور اشتراکیت پر لگا دیا۔۔۔۔ کیفی کی شاعری میں سیاسی بلند آہنگی نے انہیں نقصان پہنچایا۔ ان میں اظہار کی جو بلا کی صلاحیت تھی اس کی چمک ان کی ہر نظم، اس کے اشعار اور ان کی لفظی صورت گری میں نظر آتی ہے۔ لیکن جب وہ سیاست پر زور دینے یا تبلیغ کرنے لگتے ہیں تو ان کی شاعری کا تاثر کم ہو جاتا ہے۔ ’’[۱۳]

’’جدید اردو شاعری کے باغ میں ایک پھول کھلا ہے، سرخ پھول۔ وہ اشتراکیت کا پر جوش حامی ہے، سویت روس کا گہرا دوست ہے اور اب وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی ہے۔ اس کے خیال و مقصد حیات، اس کی زندگی اور عمل میں تضاد نہیں ہے۔ اگر وہ انقلاب اور مزدور راج کے گن گاتا ہے تا اسے اس کا حق ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی محنت کشوں کی خدمت اور ان کی جدوجہد میں شرکت کے لیے وقف کر دی ہے۔‘‘ ۱۴

’’ ان کی جدید ترین نظموں میں فکر کی صلابت اور پختگی برابر نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ کیفی نے بڑی اور حقیقی شاعری کے اصرار ورموز کو پالیا ہے۔ ان کے موضوعات اب بھی اشترا کی نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر ان کے شاعرانہ اظہار میں ضبط و نظم توازن اور فنی بصیرت نے قدر اول کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔‘‘ ۱۵

’’ پہلے کمٹ منٹ کا تعلق بڑی حد تک پارٹی لائن تک محدود تھا اور کمٹ منٹ کی نوعیت عقیدت مندی کی رہ گئی ہے۔ اب نہ صرف اس کا دائرہ وسیع ہوا ہے بلکہ عقیدت نے تشکیک کو راہ دی ہے۔ تشکیک عذاب سے گذر کر ہی شاعر کے تجربے میں صداقت اور جذبات میں تڑپ پید ہوتی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ آوارہ سجدے کی نظمیں زیادہ جاندار اور تجربات کی صداقت پر پوری اترنے والی ہیں۔"۱۶

"کیفی کا مزاج غزل کا مزاج نہیں بلکہ اختر الایمان کی طرح ان کا مزاج بھی نظم نگار کا مزاج ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں بھی نظمیہ کے اثرت در آئے ہیں۔ بحثیت نظم نگار انہوں نے زندگی کے انگنت پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے اور زندگی کی سچائیوں کو پیش کیا ہے۔"۱۷

حواشی:

۱ کیفی اعظمی: شخصیت، شاعری اور عہد۔ ص۔ ۷۹

۲ کیفی اعظمی، میں اور میری شاعری، کیفی اعظمی، عکس اور جہتیں، شاہد ماہلی، ص ۴۷۔

۳ جہات و جستجو، ڈاکٹر مظفر حنفی۔ ص ۱۱۳

۴۔ کیفیات: کیفی اعظمی ص ۱۰، ۹

۵ آخری سب کے ہمسفر، نامی انصاری، مضمون مشمولہ کیفی اعظمی: فن اور شخصیتشاہد ماہلی، ص ۳۶۶، ۳۶۵

۶ جہات و جستجو، ڈاکٹر مظفر حنفی۔ ص ۱۱۶

۷۔ کیفی اعظمی معاملات جہاں کا شاعر۔ انور سید، کیفی اعظمی، عکس اور جہتیں۔ شاہد ماہلی، ص ۱۵۷

۸۔ کیفیات: دو چار باتیں ص ۶۶۹

۹۔ جدید اُردو ادب، ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۵۷، ۱۵۶

۱۰۔ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۴۷

۱۱۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ سید احتشام حسین ص ۲۸۴

۱۲۔ جدید اُردو نظم اور یوروپی اثرات، ڈاکٹر حامدی کاشمیری ڈ ۳۳۹

۱۳۔ کیفی کا شعری سفر، شارب ردولوی کیفی اعظمی، عکس اور جہتیں، ص ۱۸۱، ۱۸۰

۱۴۔ کیفی اعظمی: شخصیت، شاعری اور عہد۔ ڈاکٹر وسیم انور ص ۲۷۲

۱۵۔ آخری شب کا ہمسفر نامی انصاری۔ کیفی اعظمی، عکس اور جہتیں، ص ۳۸۲

۱۶۔ کیفی اعظمی: شخصیت، شاعری اور عہد۔ ڈاکٹر وسیم انور ص ۲۷۵

۱۷۔ کیفی اعظمی: شخصیت اور فن، زرینہ ثانی ص ۳۱۷

باب پنجم

کیفی اعظمی بحیثیت فلمی شاعر

کہانیوں اور قصّوں کی طرح گیت سے بھی انسانی زندگی کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف ارتقائی مراحل سے گزرنے میں جس طرح قصے اور کہانیوں کی اہمیت ہے اسی طرح انسانوں کے جذبات، احساسات، اُمنگوں اور رنج و غم اور مسرت و شادمانی کے لمحات کے اظہار کے لیے انسان نے اپنی اپنی زبان میں گیتوں کا بھی سہارا لیا۔

جنگلوں اور غاروں سے گزرتے ہوئے انسان نے سماجی اور شہری زندگی کی تشکیل کی۔ اس کی زندگی کے لوازمات اور تقاضوں میں اضافہ ہوا۔ مختلف موسموں، مختلف تہواروں، مختلف موقعوں کے لیے انسان نے اپنی اپنی بولیوں، زبانوں اور لب و لہجے میں گیت گائے۔

جہاں تک اردو میں ایک مستقل اصنافِ سخن کی حیثیت سے گیت کے ارتقاء اور وجود کا تعلق ہے، تو ظاہر ہے کہ غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ کے مقابلے میں گیتوں کی باقاعدہ ادبی صنف وجود میں نہیں آئی۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں اس کی تلاش بے سود بھی نہیں ہے۔ خصوصاً پہلی جنگ عظیم کے بعد شعراء نے اس صنف کو ادبی حیثیت ضرور دے دی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اجمل اجملی کے اس خیال سے اتفاق کیا جاسکتا جو انہوں نے اردو گیتوں کی ابتدا اور اس کے ارتقاء پر پیش کیا ہے۔

''دراصل اردو گیت کو ادبی مقام دلانے اور اس بھولی بسری چیز کو دریافت کرنے کا سہرا رومانی تحریک کے شعراء عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور الطاف مشہدی وغیرہ کے سر ہے۔ جنہوں نے گیت کے فنی سانچے کو اپنے پورے پس منظر کے ساتھ اپنایا اور پورے لوازمات کے ساتھ پیش کر کے خواص میں مقبول بنایا۔ یہ داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک میراجی کا نام نہ لیا جائے جو اپنی نظموں کے تمام دھندلے پن کے برعکس گیتوں میں عوامی جذبات اور احساسات کے فطری اظہار سے بہت قریب نظر آتے ہیں، اور میراجی نے گیتوں کے لیے کہا ہے'' شعر کی اولین صنف گیت ہیں۔ زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس مقابلے میں پہنچنے کے بعد فراغت کی کیفیت سے مست، ہونے کے لیے بتدائی اکیلے انسان کو سنگیت کی ضرورت تھی اور تنہائی کے لمحوں میں اس کی اپنی آواز اس کا ساتھ دیتی ہے۔''[۱]

جہاں تک ہندوستان میں اردو میں گیتوں یا نغموں کی ترویج و ترقی کا تعلق ہے اس صنف کی ابتدائی اور نشو و نما میں ہندوستانی فلموں کا رول ابہت اہمیت بھی رکھتا ہے اور اس کے فروغ کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ تمام تر فلمی نغمے گیت ہیں جیسا کہ عام طور

سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فلمی کہانی کا محور اور مرکز عشق و محبت کی داستان ہوتی ہے۔ اسی ایک غالب عنصر کے آس پاس پوری فلمی کہانی رفتہ رفتہ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ فلم میں اس کے علاوہ اور بھی ذیلی مناظر اور مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں گیتوں کے ذریعے تاثر اور اثر آفرینی میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

فلموں کا ابتدائی دور ہر چند خموش فلموں کا دور رہا ہے لیکن آگے چل کر جب آواز کی گنجائش پیدا ہوئی تو گیتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور جب سائنسی ترقی اور ٹیکنولوجی کا دور شروع ہواس اور بولتی فلمیں منظر عام پر آنے لگیں تو گیتوں کو بھی فلموں میں جگہ دی گئی۔ آزادی سے قبل رومانوی رجحان اور پھر ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور عروج نے آزادی کے بعد کا یہی وہ زمانہ تھا جب ملک میں ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں تھیں۔ مزدوروں، کسانوں، اور سماج کے محنت کش طبقہ کے مسائل کو ادب میں جگہ دینا اس تحریک کے اولیں مقاصد میں شامل تھا۔ آزادی ملنے کے بعد ایسے مسائل سے ہندوستان کے ہر گاؤں اور ہر شہر دوچار تھے۔ لہذا بالخصوص نوجوان شعراء اس تحریک سے بیحد متاثر ہوئے اس لیئے شعراء نے اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کے لیے غزل اور دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں نظم کا سہارا لیا۔ اور گیتوں کو فروغ دیا۔ ان میں و جوش، جاں نثار اختر، فیض، فراق، مخدوم، مجروح، مجاز، ساحر، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی سبھی شامل تھے۔

جہاں تک فلمی گیت کاروں کا تعلق ہے تو اردو نغمہ نگاروں نے جمیل مظہری، آرزو لکھنوی، نخشب، شکیل بدایونی، راجندر کرشن، شیلیندر وغیرہ نے اپنا سکہ جمایا۔ ان میں مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی وغیرہ کو بڑی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہے۔ ان شعراء اکرام کے پیش نظر ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد اولیت کا درجہ رکھتے تھے۔ جب ان شعراء نے فلموں کی طرف رجوع کیا تو انہیں مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقہ کی آواز کو موثر ترین طریقے سے پیش کرنے کا موافق ذریعہ ملا اور ان شعراء نے اپنے اپنے طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے ان صنف میں بھی اپنے خیالات سمونے شروع کیے، لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے اس مقصد کی ادائگی میں بہت حد تک کامیاب و کامران بھی رہے۔

زیر نظر مضمون میں ہمیں چونکہ ''کیفی اعظمی کی فلمی شاعری'' کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان محرکات اور ان عوامل جا اجمالی جائزہ لینا ضروری ہوگا جن کے زیر اثر کیفی فلمی گیتوں کی طرف راغب و متوجہ ہوئے۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا گیا ہے کہ کیفی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے، نیز اس تحریک سے وابستہ دیگر اہم ہستیوں مثلاً علی سردار جعفری، سید سجاد ظہیر، اور دیگر حضرات سے وابستہ ہوئے جن کی صحبتوں سے انہیں رفتہ رفتہ

پارٹی کی سطح پر نظمیں کہنے کا موقع ملا۔ ابتدا میں انہوں نے رومانی شاعری کی۔ جس میں بھی انقلاب اور بغاوت کا پہلو نمایاں تھا۔ یہ دور کیفی کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ خلیل الرحمان اعظمی نے کیفی کی ایسی رومانی اور جمالیاتی موضوعات سے لبریز نظموں کو ''خوبصورت اور تراشی ہوئی نظمیں'' کہا ہے۔

کیفی کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی رکن بن گئے اور ان کی شاعری کا دھارا اس دور میں سیاسی اور سماجی مسائل کی طرف مڑ گیا۔

کیفی اعظمی کی شاعری کا تیسرا اور قدرے مایوس کن دور وہ ہے جب کمیونزم کا زوال واقع ہوا۔ کمیونزم جہاں سے پیدا ہوا تھا وہی سرزمین اس کی قربان گاہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں بھی کمیونسٹ پارتی کا شیرازہ بکھر گیا۔ لیکن ایسے دور میں بھی کیفی اعظمی نے حوصلہ اور ہمت سے کام لیا۔

کیفی اپنی انقلابی، سماجی اور سیاسی نظموں کے ساتھ ساتھ گیت بھی لکھتے رہے۔ ان کے چند گیت ایسی نوعیت کے ہیں جو کسی فلمی کہانی کے تقاضہ پر نہیں لکھے گئے لیکن بعد میں موقعِ محل کے مناسبت سے بغیر کسی ترمیم کے یا پھر جزوی ترمیم و اضافہ کے بعد کسی فلم میں فلمائے گئے ہیں۔ مثلاً حقیقت فلم کا یہ نغمہ دیکھیں۔

ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہو گا
زہر چپکے سے دوا جان کے کھایا ہو گا

دل نے کچھ ایسے بھی افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہو گا
ہو کے مجبور ----

اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہو گی
مٹ کے اک نقش نے سو شکل دکھائی ہو گی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہو گی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہو گا
ہو کے مجبور ----

چھیڑ کی بات پہ ارماں مچل آئے ہوں گے
غم دکھاوے کی ہنسی میں ابل آئے ہوں گے

نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہو گا
ہو کے مجبور ۔۔۔۔

زلف ضد کر کے اسی نے جو بنائی ہو گی
اور بھی غم کی گھٹا مکھڑے پہ چھائی ہو گی
بجلی نظروں نے کئی دن نہ گرائی ہو گی
رنگ چہرے پہ کئی روز نہ آیا ہو گا
ہو کے مجبور۔۔۔۔

کیفی اعظمی کے گیتوں کا مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۹ء میں ''میری آواز سنو'' ہندی میں شائع ہوا۔ بعد میں اردو میں شائع ہو کر اس مجموعے میں شامل گیتوں کی تعداد وہی ہے جو کسی نہ کسی فلم میں فلمائے گئے ہیں۔ اس سے قبل ۱۹۷۴ء میں اس عنوان سے اردو میں بھی شائع ہو چکا تھا۔

جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ گیتوں کا تعلق انسان کے داخلی جذبات واحساسات سے زیادہ ہے، انسان اپنی زندگی کے گوناگوں مسائل و مراحل سے دوچار ہونے کے درمیان اور بھی کچھ سکون و اطمینان پانے کے بعد اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کے لیے گیت کا سہارا لیا کرتا ہے۔ ایسے گیتوں میں دیگر اصناف سخن کی طرح مجرد اوزان اور دیگر شعوری لوازمات

کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ سیدھے سادے لفظوں میں اور عام فہم پیرائے میں بات مترنم لب و لہجے میں کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ارتضا کریم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اس اعتبار سے غور کیا جائے تو کیفی اعظمی کے گیتوں میں داخلیت بھی ہے، غنائیت بھی، زبان کی سادگی نے انہیں مقبول بھی بنایا ہے۔ اور ان کے گیتوں کے مضامین بھی متنوع ہیں۔''[۲]

مذکورہ بالا ''گیتوں کا مجموعہ'' ''میری آواز سنو'' ایک سو چار گیتوں پر مشتمل ہے۔ کسی بھی مجموعہ کلام یا تصنیف سے متعلق دیگر ناقدین یا تبصرہ نگاروں کی رائے سے زیادہ جامع و درست اور ٹھوس اظہار و خیال خود مصنف کا اپنے اور اپنے کلام کے بارے میں خیال یا عرض حال ہوتا ہے۔ جو عموماً خلوص سے پُر اور تصنع سے خالی ہوا کرتا ہے۔ لیکن ''میری آواز سنو'' میں شامل گیتوں کی نوعیت اور ان کے شان نزول سے متعلق کیفی نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ لیکن اس مجموعہ گیت میں شامل گیتوں کے بارے میں ان کے حسب ذیل رائے کی اہمیت وافادیت بامعنی ہو جاتی ہے۔ ''میری آواز سنو'' کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں

: ''ممکن ہے کچھ دوست یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ سنگیت اور گانیوالوں کی آوازوں سے الگ کرو تو ان میں کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں؟ اگر کچھ دوستوں نے سوچا ہو تو ان سب گیتوں کے باریمیں نہ سہی کچھ گیتوں کے بارے میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان سے ان کی دھن اور سنگیت الگ کر لی جائے تو گیتوں کے معنی ابھر آئیں گے۔''[۳]

دراصل حقیقت یہ ہے کہ گیت کی معنویت اور اثر پذیری کا بہت کچھ تعلق گیت کے بول اور مضامین کے علاوہ اس منظر نامے اور کہانی کی situation پر ہے جہاں وہ گیت فلمایا گیا ہو۔ اس کی موسیقی نیز گلوکار کی آواز کی بھی اپنی جداگانہ اہمیت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ کیفی کے اکثر فلمی نغمے اپنی اثر پذیری یا تاثر کے سبب سے سنگیت اور آواز کے محتاج بھی نہیں ہیں۔ یوں بھی ایسے گیت ہمیشہ اور ہر حال میں سدا بہار ہی رہتے ہیں اور دلوں میں گھر کرتے ہیں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے کیفی کو فلمی دنیا کی طرف راغب کیا۔ کیفی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن ہو چکے تھے۔ اور پارٹی کے گوناں گوں تقاضوں میں اپنے آپ کو مصروف عمل رکھے ہوئے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ فلمی دنیا کی طرف متوجہ ہوئے۔ دراصل

آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں اور خصوصاً نوجوان شاعروں مثلاً جاں نثار، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری اور مجاز وغیرہ بمبئی پہنچے۔ جہاں مزدوروں اور محنت کشوں کا ایک بڑا طبقہ استحصال و ناانصافی کا شکار تھا۔ اس کے علاوہ بمبئی جیسے شہر میں روزی روٹی کے مواقع بھی میسر و موجود تھے۔

چنانچہ جس وقت کیفی نے ممبئی کی طرف رخ کیا، ان کی آمدنی کا کوئی مستقل اور خاطر خواہ ذریعہ تھا ہی نہیں۔ پارٹی میں شریک ہوئے تو انہیں پارٹی کی طرف سے صرف پینتالیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ کیفی کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کے سامنے یہ مختصر سی آمدنی ان کے لیے ناکافی تھی۔ شادی ہو جانے کے بعد اخراجات میں مزید اضافہ ہوا۔ لہٰذا کیفی نے ایک یومیہ اخبار میں روزآنہ پانچ روپے پر ایک مزاحیہ نظم لکھنا شروع کیا۔ یہ بھی ناکافی ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے بھی کام کرنا شروع کیا۔ ان کی بیوی شوکت کی تعلیم تو صرف میٹرک ہی تک تھی۔ لیکن انہوں نے کیفی کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر ان کا ہر طریقے سے ساتھ دیا۔ اور جس کام کو بھی اپنایا اسے بخوبی انجام دیا۔ اول تو انہوں نے انڈین پیوپلز تھیٹر میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد ریڈیائی ڈراموں میں بھی حصہ لیا۔ کبھی کبھی کسی فلم کی ڈبنگ بھی مل

جاتی۔ بقول شوکت کیفی:

''کیفی کی پارٹی سے آمدنی صرف پینتالیس روپے تھی جس میں تیس روپے کھانے کے کٹ جاتے تھے۔ باقی رہے پندرہ روپے، تو اس میں سگریٹ اور ریلوے پاس کا خرچہ میرے پہ کوئی پیسہ نہ بچتا۔ پارٹی تنخواہ مجھے نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے پالنے کے لیے کیفی نے ایک ڈیلی نیوز پیپر میں پانچ روپے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی۔ کبھی کبھی تو مجھے ان پر رحم آنے لگتا۔ آنکھ کھلتے ہی انہیں یہ گھبراہٹ ہوتی کہ نظم لکھنی ہے۔ اور فوراً کاپی پینسل لیکر بیٹھ جاتے۔''[۴]

شبانہ اعظمی کی پیدائش کے بعد کیفی کے اخراجات میں اور اضافہ ہوا۔ دوا علاج، تعلیم و تربیت وغیرہ کے لیے مزید آمدنی کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کیفی کو آہستہ آہستہ فلموں میں کام ملنے لگا۔ یہیں کیفی اعظمی کی فلموں سے وابستگی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں اپنی فلم ''بزدل'' کے لیے شاہد لطیف نے کیفی سے دو گانے لکھنے کی گزارش کی۔ کیفی نے دو گیت لکھے جو حسب ذیل ہیں:

روتے روتے گزر گئی رات رے
آئی یاد تری ہر بات رے

نیند بھی مری نا میری ہو سکی
رو کے شبنم بھی نہ یہ غم دھو سکی
تھی میں تری پر نہ تیری ہو سکی

روتے روتے۔۔۔۔۔

خواب کی دنیا اجڑ کر رہ گئی
چھین لی سورج نے گھر کی روشنی
چاند سے دور ہوتی ہے اب چاندنی

روتے روتے۔۔۔۔۔

پیار کی گھڑیاں بہت یاد آئیں گی
یاد آکر رات دن تڑپائیں گی
تم کو یہ تنہائیاں ڈس جائیں گی

روتے روتے۔۔۔۔۔

اسی فلم کا ایک اور گیت پیش ہے۔

منجدھار میں کشتی ڈوب گئی کچھ ایسا نصیب پھوٹ گیا
جب ہاتھ بڑھے دامن کی طرف دامن بھی تمہارا چھوٹ گیا

کاہے اب رے بلم

دھیرے دھیرے تیرا غم

ڈھائے دل پہ ستم

کاہے اب رے بلم

تولا کھ ستا تولا کھ رلا

الفت کا مٹنا مشکل ہے

قدموں پہ ترے جو ڈال دیا

اس دل کا اٹھانا مشکل ہے

کیسے باز آئیں گے ہم

دھیرے دھیرے ڈھاے دل پہ ست

کاہے اب رے بلم

اس کے بعد کیفی نے گرو دت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' کے لیے گانا لکھا جو بہت ہی مشہور ہوا۔ موہن سہگل کی فلم ''اپنا ہاتھ جگن ناتھ'' اور گرو دت کی فلم'' کاغذ کے پھول'' کے جو گانے لکھے وہ بہت مقبول ہوئے۔ بزدل کے بعد بہت سی فلمیں آئیں۔ کاغذ کے پھول تو بہت بعد میں آئی۔ کیفی کی فلمی شاعری کو مستحکم اور مقبول بنانے میں گویا سنگ میل ثابت

ہوئے۔ یہاں پہ گانے آج بھی گانے سدابہار رہے اوران کی دلکشی باقی ہے۔
مذکورہ گیتوں کا حوالہ دل چسپی سے خالی نہ گا۔

وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم
بیقرار دل اس طرح ملے
جسطرح کبھی ہم جدا نہ تھے
تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے
ایک راہ پر چل کے دو قدم
وقت نے کیا۔۔۔۔۔

جائیں گے کہاں، سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بنرہے ہیں دل خواب دم بہ دم
وقت نے کیا۔۔۔۔۔
(کاغذ کے پھول)

اپنے ہاتھوں کو پہچان

مورکھ ان میں ہے بھگوان

مجھ پر تجھ پر سبھی پر

ان دونوں ہاتھوں کا احسان

اپنے ہاتھوں کو پہچان

ہاتھ اٹھاتے ہیں جو کدال پربت کاٹ گراتے ہیں

جنگل سے کھیتی کی طرف موڑ کے دریا لاتے ہیں

چٹکی بھر دانے لیکی وہ جو زمیں میں پر بکھرائے

جتنے تارے چمکتے ہیں اتنے ہی پودے اگائے

بھوک جہاں تک دیکھ سکے کھیت وہاں تک لہرائے

چونے گارے اینٹوں سے ہے ہاتھوں کا ہے یارانہ

رکھے نیو سے جب چھت کو گگن دے نزرانہ

بستا جائے شہر نیا سجت جائے ویرانا

اپنے ہاتھوں کو پہچان

چھینی اور ہتھوڑے کا کھیل اگر یہ دکھلائیں

ابھرے چہرے پتھر پہ دیو دیوتا مسکائیں

چمکے چمکے تاج محل

آنکھ جھپکتے لگ جائے میلا کورے برتن کا
ہاتھ چھو لینے سے سونا بنتا ہے زیور
روپ کو چمکا دیتے ہیں کنگن جھمکے اور جھومر
بین سرنگ طبلہ ڈھولک سب کچھ ہاتھ بجاتے ہیں
تاروں میں آواز کہاں ہاتھ تمہارے گاتے ہیں

(اپنا ہاتھ جگنناتھ)

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

اب نہ وہ پیار نہ اس پیار کی یادیں باقی
آگ یوں دل میں لگی کچھ نہ رہا کچھ نہ بچا
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے بیٹھی ہو
میں وہ دلدار نہیں اسکی ہوں خاموش چتا

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی۔۔۔

زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا
خیر ہنس کے سہی رو کے گزر جائے گی
راکھ برباد محبت کی بچا رکھی ہے
بار بار اس کو جو چھیڑا تو بکھر جائے گی

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی۔۔۔

آرزو جرم، وفا جرم، تمنا ہے گناہ
یہ وہ دنیا ہے جہاں پیار نہیں ہو سکتا
کیسے بازار کا دستور تجھے سمجھاؤں
بک گیا جو وہ خریدار نہیں ہو سکتا

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی۔۔۔

(شعلہ اور شبنم)

فلمی دنیا میں کیفی نے گیت تو بے شمار لکھے ہیں لیکن سب کا حوالہ محض حوالہ بن کر نہ رہ جائے۔ چند مثالیں ہی دی جائیں گی تا کہ مختلف نوعیت کے گیتوں کا اندازہ ہو سکے۔

کیفی نے فلمی گانوں کے ساتھ ساتھ فلموں کے لیے مقالمے، اسکرین پلے اور اسکرپٹ وغیرہ بھی تحریر کیے۔ ''ہیر رانجھا'' فلم جو شروع سے آخر تک منظوم ہے۔ اس فلم کو منظوم کرنے کا بھی بھاری پتھر کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن کیفی نے اس چیلینج کو قبول کیا۔ اور قبول ہی نہیں کیا بلکہ کامیاب طریقے سے مکمل کیا۔ یہ فلم نہایت مقبول ہوئی۔ اس کے مقالمے اور نغمے آج بھی ذہن و دل کا حصہ ہیں۔ مثلاً اس طرح کے نغمے:

یہ دنیا، یہ محفل مرے کام کی نہیں
کس کو سناؤں حال دل بے قرار کا
بجھتا ہوا چراغ ہوں اپنے مزار کا
اے کاش بھول جاؤں مگر بھولتا نہیں
کس دھوم سے اٹھا تھا جنازہ بہار کا
یہ دنیا کہ محفل مرے کام کی نہیں

اپنا پتہ ملے نہ خبر یار کی ملے
دشمن کو بھی نہ ایسی سزا پیار کی ملے
ان کو خدا ملے ، ہے خدا کی جنہیں تلاش
مجھ کو بس اک جھلک مرے دلدار کی ملے
یہ دنیا کہ محفل مرے کام کی نہیں

صحر ا میں آکے بھی مجکھ کو ٹھکانہ نہ ملا
غم کو بھلانے کا کوئی بہانہ نا ملا
دل ترسے جس میں پیار کو کیا سمجھوں اس سنسار کو
اک جیتی بازی ہار کے میں ڈھونڈوں بچھڑے یار کو
یہ دنیا کہ محفل مرے کام کی نہیں

دور نگاہوں سے آنسو بہاتا ہے کوئی
کیسے نہ جاؤں میں مجھ کو بلاتا ہے کوئی
یا ٹوٹے دل کو جوڑ دو یا سارے بندھن توڑ دو
اے پربت رستہ دے مجھے اے کانٹو دامن چھوڑ دو
یہ دنیا یہ محفل مرے کام کی نہیں۔

اسی طرح سے فلم ‘‘گرم ہوا’’ ہے۔ جس کی کہانی مکالمہ اور اسکرین پلے کیفی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مجموعی خدمات کئے عوض کیفی کو فلم فیئر کے تین ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ایک کہانی کا دوسرا ڈائلاگ اور تیسرا اسکرین پلے کا۔ اس کہانی کے لیے انہیں نیشنل ایوارڈ بھی دیا گیا۔

‘‘گرم ہوا’’ ایسی پہلی فلم ہے جس میں نہایت جرائت مندی سے ملک کی تقسیم کی اور تقسیم سے پیدا شدہ سیاسی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ آزادی حاصل ہونے کے بعد دونوں ملکوں کو پیش آنے والے درد انگیز اور قابل توجہ نتائج کو بہت ہی حقیقت پسندی اور دلدوز طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح جب غالب کی تقریبات کا سلسلہ چلا تو غالب کے متعلق

ستھیون نے ایک مختصر فلم تیار کی۔ یہ مختصر دستاویزی اور تاریخی حیثیت کی حامل فلم کیفی صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں آواز بھی انہیں کی ہے۔ غالب سے متعلق اس مکمل فلم کا افتتاح ''ڈاکٹر ذاکر حسین'' کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس فلم کے متعلق محمد مہدی فرماتے ہیں؛

> ''اب تو سنا ہے کہ ایک مشہور ڈائریکٹر کیفی سے غالب کی اسکرپٹ بھی لے گئے اور اعلان کر دیا کہ اسکرپٹ کھو گئی۔ کیفی کو غالب سے اتنا لگاؤ ہے اور اس فلم میں وہ اس قدر الجھے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان کے کچھ خطوں سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خط میرینام ہیں اور کچھ میری بیوی کے نام۔ وہ فلم تو نہ بن سکی لیکن اس کی یاد دلوں میں اب بھی باقی ہے۔''[۵]

ایک عام خیال یہ ہے کہ فلمی گیتوں میں نغمہ نگار ادبی معیار قائم رکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ بات نغمہ نگار اور ان کے کچھ گیتوں سے متعلق تو کہی جا سکتی ہے لیکن ترقی پسند شاعروں کے ذریعے لکھے گئے گیتوں کا تعلق ہے تو ایسے شاعروں نے فلمی گیتوں میں کافی حدتا کادبی معیار کی پابندی کی ہے۔ اس کے سبب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلمی گیتوں کا مزاج اور آہنگ ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد سے کافی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ وہ اپنے مقصد کی تسکین اور

حل کے لیے فلمی کہانیوں اور اس کے ذریعے گیتوں کے حوالے سے اپنے نسب العین کی تسکین بہ آسانی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایسے شعراء جنھوں نے فلمی گیتوں کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کے پیغامات کو عوام تک پہنچایا اور اس میں ادبی معیار بھی برقرار رکھا، چند نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، شیلیندر، کیفی اعظمی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن شکیل بدایونی کی ادبیت کو بھی نذر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں بھی اہمیت کے لحاظ سے ساحر کو تقویت حاصل ہے کہ ساحر نے اپنے نغموں کے ذریعے ادب اور ترقی پسند نظریات کی آمیز کر کے گیتوں کو اعتبار و معیار عطا کیا ہے۔ لہٰذا غور کریں تو ان کے نغموں کا معتد بہ حصہ ان اوصاف سے معمور ہے۔ لہٰذا انہوں نے بہ جا طور پر فلمی نغموں کو ایک علاحدہ صنف کی حیثیت بھی دے دی ہے۔ جب کہ فلمی نغمے مختلف پابندیوں کے زیر اثر لکھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی کمال حاصل کر لینا فکری رفعت کا ثبوت ہے۔ اپنے گیتوں کا مجموعہ ''گاتا جائے بنجارا'' میں لکھتے ہیں:

> ''ظاہر ہے کہ ان تمام پابندیوں کے ساتھ جو شعری ادب ظہور میں آئے گا وہ ان فلمی بلندیوں کو نہیں چھو سکے گا جو ادب عالیہ کا حصہ ہے۔ پھر بھی اس صنف کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اپنا ایک دائرہ

ہے۔ جو کتب ورسائل، ریڈیو اور تھیٹر سب سے وسیع ہے۔''[٦]

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا کہ فلمی گیتوں میں ادبی معیار برقرار رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیوں کہ نغمہ نگار کو کئی شرائط اور پابندیوں کے درمیان گیت کمپوز کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ ادبیت سنجیدگی اور ٹھہراؤ کی متقاضی ہوتی ہے، اور ہر گیت یا گیت کا ہر شعر اس کا متحمل نہیں ہوتا کہ ادبیت کی قیمت پر منظر اور کہانی کو قربان کر دیا جائے لیکن دیگر ترقی پسند شاعروں کیساتھ ساتھ کیفی نے بھی حت الامکان اپنے گیتوں میں ادبیت کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں محمد ذاکر تحریر فرماتے ہیں:

''ترقی پسندوں نے فلمی گیتوں میں بھی شعریت اور ادبی معیار کا خیال رکھا ہے۔ انہیں تخلیقات کے پیش نظر اب فلمی گیت کو محض ایک تک بندی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے فلمی گیت کو حسن بیان بھی بخشا ہے۔ اور تخیل کی لطافت اور جذبت کی پاکیزگی بھی۔ ان کے اکثر گیت اس دور کی اردو شاعری میں ایک نمایاں اضافہ ہیں۔ (ان میں سے کچھ گیت کتابی صورت میں بھی شایع ہو گئے ہیں''[۷]

فلمی شاعر بھی چونکہ ایسی چلتی پھرتی دنیا اور جیتے جاگتے سماج کا ایک

فرد ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے بھی مختلف تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے بھی روزی روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ چونکہ فلمی گیت بہت طویل بھی نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ دیگر اصناف سخن کی تخلیق میں لازمی شرائط کی پابندی بھی گیت میں ضروری یا لازمی نہیں ہوتی اور اس کے عوض اچھی خاصی رقم معاوضہ میں مل جاتی ہے۔ تاہم اکثر ترقی پسند شعراء نے محض معاوضہ کے لیے نغمے نہیں لکھے بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیت سے نئے نئے گیتوں سے فلمی دنیا کو مالا مال بھی کیا۔ بقول ڈاکٹر اجمل اجملی ذیل میں فرماتے ہیں:

"فلمی گیتوں نے ترقی پسند خیالات کو عام کرنے اور محنت کش عوام کو جدوجہد پر ابھارنے کے سلسلے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ یہ بات پوری وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے بھی مقاصد کی تبلیغ کے لیے فلم کے امکانات سے پوری طرح استفادہ کیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اہم اہم ترقی پسند شعراء نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی اس طرف توجہ دی۔ پاکستان میں حمایت علی شاعر، حبیب جالب اور خود فیض احمد فیض نے ایسے گیت لکھے ہیں جن میں ترقی پسند گیتوں کی ساری روایت موجود ہیں۔"[8]

کیفی اعظمی نے فلموں کیلیے جو گیت لکھے اگر انہیں فلم کے پردے سے ہٹ کر دیگر ذریعے سے سنا یا پڑھا جائے تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ فلمی منظر یا دھنوں کی پابندی کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی واقعے، تجربے یا حوادث سے دوچار ہونے کے بعد معرض تحریر میں آتے ہیں۔ کیفی کے ایسے گیتوں میں شعریت بھی ہے، ادبیت بھی، گہرائی بھی ہے، سنجیدگی بھی ہے اور وابستگی بھی۔ ایسے گیت جب پردۂ سیمیں پر کسی فلم کے منظر نامے کے تحت گلوکار اور سنگیت کار کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں تو سدا بہار بن جاتے ہیں۔ دوسرے نغمہ نگاروں کی طرح کیفی کے بھی اکثر گیت موسیقی کے دھنوں اور دیگر فلمی تقاضوں کے تحت تبدیلیاں آئی ہیں جو اوزان میں بھی در آئی ہیں اور ہئیت میں بھی۔ کیفی نے فلموں کے لیئے جو گیت لکھے ہیں ان میں غزل نما گیتوں کے علاوہ نظم کی ہیت کے گیت بھی شامل ہیں۔ رنجیدہ فلموں میں غزل نماں گیت زیادہ ہیں۔ اسکے علاوہ کیفی کی اکثر نظمیں جزوی تبدیلی کے ساتھ فلموں میں لی گئی ہیں۔

کیفی نے فلمی کہانی اور مناظر کی نوعیت کے لحاظ سے رومانی گیت بھی لکھے اور سیاسی بھی اور انقلابی نوعیت کے بھی۔ لیکن کیفی کا امتیاز یہ ہے کہ انہیں اکثر حب الوطن پر مبنی گیت لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ کیوں کہ کیفیؔ فطری

طور پر آزادئ وطن اور حب الوطنی کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہے ہیں۔ انہیں اپنے مادروطن سے عشق کی حد تک لگاؤ رہا ہے۔ اس سلسلے میں سبودھ لال کا خیال خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

”کیفی کو اکثر ایسی فلموں کے گیت لکھنے کو کہا گیا جہاں دیس بھکتی کا جذبہ کہانی کا اہم حصہ ہو۔ مثلاً حقیقت، ہندوستان کی قسم، نونہال اور دیگر فلموں میں کیفی میں جو دیس بھکتی کے گیت لکھے ہیں وہ فلمی شاعری میں اس قسم کے بہترین گیتوں میں شامل ہیں۔“ ۹

مثال کے طور پر فلم حقیقت کا گیت ”کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیوں، اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو“۔ اس پورے گیت میں ایک ایک لفظ سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے۔ ایک ایک حصہ اور شعر حب الوطنی کے شدید اور مخلصانہ جذنے سئے سرشار ہے۔ وطن کی فلاح، حفاظت اور جان تک کی قربانی کا شدید جذبہ اور احساس اس پورے گیت میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ کیفی کا یہ گیت ہندوستان میں یوم جمہوریہ اور یوم آزادی کے ایام میں پابندی سے بجایا اور سنایا جاتا ہے۔ اور وہ گیت یہ ہے:

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو !

اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو !
سانس تھمتی گئی نبض جمتیگئی
پھر بھی بڑھنے قدم کو نہ رکنے دیا
کٹ گئیسر ہمرے تو کچھ غم نہیں
سر ہمالہ کا ہم نے نہ جھکنے دیا

مرتے مرتے رہا بانکپن ساتھیو !
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو !

زندہ رہنے کے موسم بہت ہیں مگر
جان دینے کی رت روز آتی نہیں
حسن اور عشق دونوں کو رسوا کرے
وہ جوانی جو خوں میں نہاتی نہیں

آج دھرتی بنی ہے دلہن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

راہ قربانیوں کی نہ ویران ہو
تم سجاتے ہی رہنا نئے قافلے
فتح کا جشن اس جشن کے بعد ہے
زندگی موت سے مل رہی ہے گلے

باندھ لو اپنے سر سے کفن ساتھیو !
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو !

کھینچ دو اپنے خون سے زمیں پر لکیر
اس طرف آنے پائے نہ راون کوئی
توڑ دو ہاتھ اگر ہاتھ اٹھنے لگیں
چھو نہ پائے سیتا کا دامن کوئی
رام بھی تم ، تمہی لکشمن ساتھیو !
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو !

اس طرح وطن سے محبت اور اس کے رہنماؤں سے سچی اور والہانہ عقیدت محبت کا جذبہ کیفی کے کئی اور گیتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً

ملک کے پہلے وزیراعظم اور سچے وطن پرست ہردلعزیز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو سے کیفی کو دِلی محبت تھی۔ نہرو کی وفات پر مختلف شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر خراج عقیدت پیش کیا۔ کیفی کے پاس فلمی گیت کا ازبردست اور موثر وسیلہ موجود تھا۔ ایسے میں جب انہیں فلم نونہال میں گیت لکھنے کا موقع ملا تو یہ گیت لکھا:

میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
میں نے اک پھول جو سینے پہ سجا رکھ تھا
اس کے پردے میں تمہیں دل سے سجا رکھا تھا
تھا جدا سب سے سے مرے عشق کا انداز سنو

میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
زندگی بھر مجھے نفرت سی رہی اشکوں سے
میرے خوابوں کو تم اشکوں میں ڈبوتے کیوں ہو
جو مری طرح جیا کرتے ہیں کب مرتے ہیں
تھک گیا ہوں مجھے سو لینے دو روتے کیوں ہو
سو کے بھی جاگتے رہتے ہیں ضان باز سنو

میری آواز سنو، پیار کا راز سنو

میری دنیا میں نہ پورب ہے نہ پچھّم کوئی

سارے انسان سمٹ آئے کھلی بانہوں میں
کل بھٹکتا تھا میں جن راہوں میں تنہا تنہا
قافلے کتنے ملے آج انہیں راہوں میں
اور سب نکلے مرے ہم دم و ہمراز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
نہ نہال آتے ہیں ارتھیکو کنارے کو لو
میں جہاں تھا، انہیں جانا ہے وہاں سے آگے
آسمان ان کا زمیں ان کی زمانہ ان کا
ہے کئی ان کے جہاں میرے جہاں سے آگے
انہیں کلیاں نہ کہو یہ ہیں چمن ساز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
کیوں سنواری ہے یہ چندن کی چتا میرے لیے
میں کوئی جسم نہیں ہوں کو جلاؤ گے مجھے
راکھ کے ساتھ بکھر جاؤں گا میں دنیا میں
تم جہاں کھاؤ گے ٹھاکر وہیں پاؤ گے مجھے
ہر قدم پر ہے نئے موڑ کا آاز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو

اس نظم کے پہلے بند میں ”میں نے اک پھول جو سینے سے لگا رکھا تھا“ نہرو کی گلاب دوستی کی طرف اشارہ ہے۔ جو ان کی شیروانی میں اوپر کی طرف بائیں طرف (دل کے اوپر) ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اور دوسرا مصرع ”اس کے پردے میں تمہیں دل سے لگا رکھا تھا“۔ کا مطلب ہندوستان سے دلی محبت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح اس گیت کے ہر بند میں فلمی کہانی کے وسیلے سے مادر وطن سے سچی محبت اور عقیدت کے جذبات نمایاں ہیں۔ فلمی دنیا میں یہ کمال بہت کم شاعروں کے حصہ میں آیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ کیفی نے سیاسی رنگ میں گیت لکھے ہیں۔ خصوصاً خود ساختہ، مطلب پرست، خود غرض اور ملک و سماج اور عوامی دشمن رہنماؤں کے کالے کرتوتوں کو ظاہر کرتے ہوئے ایک گیت لکھا۔

ہاتھوں میں کچھ نوٹ لو، پھر چاہے جتنے ووٹ لو
کھوٹے سے کھوٹا کام کرو، باپو کو نیلام کرو
باپو باپو کرتے رہو، زہر دلوں میں بھرتے رہو
پرانت پرانت کو تنگ کرے،
بھاشا سے بھاشا جنگ کرے
سب کو چاہئے اپنی زمیں، ہندوستانی کوئی نہیں

وطن پرستی کے علاوہ کیفی کی پیغام انسان دوستی اور آدمیت بھی رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے تحت عالمی برادری اور اخوت کے علمبردار ہمیشہ رہے ہیں۔ وہ کائنات کو ایک کنبہ اور اس کے افراد کو ایک ہی کنبے کے افراد تصور کرتے ہیں۔ ان کے دکھی ہونے پر وہ دکھی اور خوش ہونے پر وہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اس طرح پیش کیا ہے۔

مبتلائے درد ہو کوئی عضو روتی ہے آنکھ
کسقدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

کیفی نے سیاسی، سماجی اور انسانی زندگی کے اقتصادی، معاشرتی وغیرہ مسائل کو بھی اپنے گیتوں میں موقع ملتے ہی جگہ دی ہے۔ فلم ”کاغذ کے پھول“ کے ایک گیت میں ان کے یہ خیالات و جذبات دیکھیے:

دیکھی زمانے کی یاری، بچھڑے سبھی باری باری
کی لے کے ملیں اب دنیا سے
آنسو کے سواس کچھ پاس نہیں
یا پھول ہی پھول تھے دامن میں

یا کانٹوں کی بھی آس نہیں
مطلب کی دنیا ہے ساری۔ بچھڑے سبھی باری باری

وقت ہے مہربان، آرزو ہے جواں
فکر کل کی کریں، اتنی فرصت کہاں
دور یہ چلتا رہے.روپ مچلتا رہے
رنگ اچھلتا رہے جام بدلتا رہے
رات بھر مہرباں ہیں بہاریں یہاں
رت گر ڈھل گئی پھر یہ خوشیاں کہاں
پل بھر کی خوشیاں ساری
بڑھنے لگی بیقراری، بچھڑے سبھی باری باری

اڑ جا ، اڑ جا، پیاسے بھنورے
رس نہ ملے گ خاروں میں
کاغذ کے پھول جہاں کھلتے ہیں
بیٹھ نہ ان گلزاروں میں
نادان تمنا ریتی میں

امید کی کشتی کھیتی ہے
اک ہاتھ سے دیتی ہے دنیا
سو ہاتھوں سے لے لیتی ہے
یہ کھیل ہے کب سے جاری، بچھڑے سبھی باری باری

انسانی سماج میں رشتے بنتے اور ٹوٹتے ہیں سنورتے بھی ہیں اور بگڑتے بھی ہیں اور بکھرتے بھی ہیں، ہزار کوشش اور احتیاط کے باوجود گردش زمانہ کی زد میں آ کر پر خلوص اور بے لوث رشتے بھی جدائی اور فرقت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ محبوب اور عاشق دونوں میں سے کوئی قصوروار اور ذمہ دار نظر نہیں آتا۔ ایسے کش مکش کے حالات میں سوائے حالات سے سمجھوتا کئے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔

ایسی ہی نوعیت کی کشمکش کو کیفی نے ”کاغذ کے پھول“ فلم کا یہ گیت نہایت ہی موثر طریقے سے پیش کیا ہے:

وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم
بیقرار دل اس طرح ملے
جس طرح کبھی ہم جدا نہ تھے

تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے
ایک راہ پر چل کے دو قدم
وقت نے کیا کیا حسیں ستم
جائیں گے کہاں سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بن رہے ہیں دل خواب دم بہ دم
وقت نے کیا کیا حسیں ستم

جیسا کہ کیفی اعظمی کی رومانی شاعری کے باب میں کیفی شاعری میں رومانی اور جمالیاتی عناصر کو واضح کیا گیا ہے۔ کیفی کی طبیعت میں ابتدا ہی سے رومان اور جمالیات سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ صنف نازک کے لطیف و نازک جذبات و احساسات کی بڑے موثر اور دل پذیر طریقے سے تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں عورت کے جذبات و خیالات کی سچی اور فطری ترجمانی کرنے میں کیفی کا کمال عروج پر آتا ہے۔ ایک دو گیتوں کے حوالے سے کیفی کی یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ فلم ہیر رانجھا کے گیت کے بول ہیں:

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں

ملو تو آنکھ چرائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
تمہیں کو دل کا راز بتائیں
تمہیں سے راز چھپائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
او بھولے ساتھیا
دیکھی جو شوخی تیرے پیار کی
آنچل میں بھر لی ہم نے
ساری بہاریں سنسار کی
نئی ادا سے ہم اترائیں
پائی خوشی لٹائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
روٹھے کبھی کبھی مان گئے
گھاتیں تمہاری ہم جان گئے
ایسی ادائیں قربان گئے
روٹھے کبھی کبھی مان گئے
تمہیں منائیں

دل بہلائیں
کیا کیا ناز اٹھائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
او سونے جوگیا رنگ لے ہمیں بھی اسی رنگ میں
پھر سے سنا دے ہنسی، کلیاں کھلا دے گورے انگ میں
وہی جو تانیں آگ لگائیں
انہیں سے آگ بجھائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں
ملو تو آنکھ چرائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،

(ہیر رانجھا)

اسی طرح فلم انوپما کے ایک مشہور و معروف گیت دیکھیے:

دھیرے دھیرے مچل اے دل بیقرار کوئی آتا ہے
یوں تڑپ کے نہ تڑپا مجھے بار بار کوئی آتا ہے